"نگار" کے مکمل فایل

۴۶ء (مع سالنامہ انتقاد نمبر) ——— ۴۷ء (مع سالنامہ ماجد ولین نمبر)

۵۲ء (مع سالنامہ حسرت نمبر) ——— ۵۳ء (مع سالنامہ داغ نمبر)

بحساب فی جلد پندرہ روپیہ علاوہ محصول۔ کمیشن نہیں ملے گا۔ منیجر نگار لکھنؤ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ جولائی میں ختم ہوگیا اور اگست کا پرچہ نو روپیہ میں وی۔پی روانہ ہوگا

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۷۸	فہرست مضامین جولائی ۱۹۵۸ء	شمارہ ۱

لاحظات ---------- ۴

ومن کا تغزل --- ڈاکٹر عبادت بریلوی ---- ۶

لاسفہ کا تصور الٰہ --- نواب محمد عباس طالب صفوی -- ۱۶

وق کی تصانیف --- محمد انصار اللہ نظر خورجوی --- ۲۲

یران میں طبی تعلیم کا نظام -- کوثر چاند پوری ---- ۲۵

ابوالعلاء المعری اور رسالۃ الغفران .. احتشام احمد ندوی .. ۲۸

جب آتش جواں تھا -- نیاز ------ ۳۶

آزاد نظم اردو شاعری میں .. پروفیسر کنول بالی۔ جموں ---- ۴۳

منظومات: رضا قریشی، طارق انصاری، شیدا کابلی، محمود عشقی -- ۴۹

مطبوعات موصولہ ---------- ۵۱

"نگار" کی ایجنسیاں

تاج نیوز ایجنسی ناگپور ——— عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ ——— محمد الیاس نیوز ایجنٹ کلکتہ ——— تجمل خاں نیوز ایجنٹ کلکتہ۔

شہرت بک ڈپو احمد آباد ——— محمد شمیم عبدالمنان احمد آباد ——— حنیف بک ڈپو۔ بمبئی ——— احمد بک ڈپو بمبئی ———

بچوں کا کتاب خانہ بمبئی ——— اپنا کتاب گھر بمبئی ——— ہندوستان بک ڈپو بمبئی ——— احمدی بک ڈپو بمبئی ———

کتاب خانہ عابد روڈ حیدر آباد ——— شہاب بک ڈپو امراؤتی ——— ماڈرن نیوز ایجنسی کھنڈوا ——— محمد الٰہ بخش دربھنگا ———

شمس بک ہاؤس برہانپور ——— حبیب برادرس جمشید پور ——— آزاد کتاب گھر جمشید پور ——— آزاد نیوز ایجنسی بنگلور ———

محمد کریم بخش مظفر پور ——— علمی خزانہ آسنسول ——— اسلامیہ بک ڈپو بھاگلپور ——— عبداللہ عزیزی اکولہ ———

فرینڈسی نیوز ایجنسی بھلواڑہ ——— نواب میگزین، رائے پور ——— آر آر راہی کرنول ——— سعید احمد ڈمکا ———

علیم احمد جودھپور ——— دار الکتاب رام پور ——— غیور احمد عثمان آباد ——— محمد شرف الدین پٹنہ ——— جمیل مرزا علیگڈھ۔

منظر امام نیوز ایجنٹ سمستی پور (دربھنگا)

پاکستان کے سول ایجنٹ:- ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی ۱۰۵۔ گارڈن ایسٹ۔ کراچی

دونوں ہیں تو ہمسائے...

مگر ایک دوسرے سے پشتوں دور!

جی ہاں، دونوں آپس میں ہمسائے ہیں، دیکھئے ۔۔ ایک سا لباس، ایک سی بود و باش، مگر یہ نہ سمجھ لیجئے کہ دونوں ہر پہلو سے ایک سے ہیں۔ ان کی اپنی اپنی انفرادیت ہے اور کبھی کبھی تو ہمسائیوں کے رہن سہن اور خیالات میں پشتوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔

انسانی طبیعت کی یکرنگی و نیرنگی کا مطالعہ نہایت دلچسپ مشغلہ ہے۔ ہندوستان لیور میں ہم مارکیٹنگ ریسرچ کے جدید علم کے ذریعے ہندوستان کے ہر حصے کے باشندوں اور ان کے ہمسائیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی مانگیں، امنگیں، پسند، ناپسند۔ ہمیں ان سب سے دلچسپی ہے۔ اس سے ہمیں آپ کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں، آپکی ضروریات سے واقفیت پہنچتی ہے جس کے مطابق ہم آپکی پسند کے مصنوعات تیار کر سکتے ہیں جو آپکے مذاق پر پورے اتریں اور آپکے طرز زندگی میں آسائش بہم پہنچائیں۔

سیکڑوں ملاقاتیں ... ہزاروں سوال جواب ... اعداد و شمار ۔ انہیں اکٹھا کرکے ان کی چھان بین کے بعد ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ۔ ان مرحلوں سے گزر کر ہمیں آپ کی ضرورتوں کی صحیح تصویر حاصل ہوتی ہے۔

اور یوں مارکیٹنگ ریسرچ کے ذریعہ آپ اپنے مشوروں سے ہماری رہنمائی کرتے رہتے ہیں ۔۔ کیونکہ یہ مصنوعات ہم آخر آپ ہی کے لئے تو تیار کرتے ہیں۔

ہندوستان لیور کا آدرش - گھر گھر کی خدمت

HLL. 10-X62 UD

ہمیشہ بڑھنے والی فصل

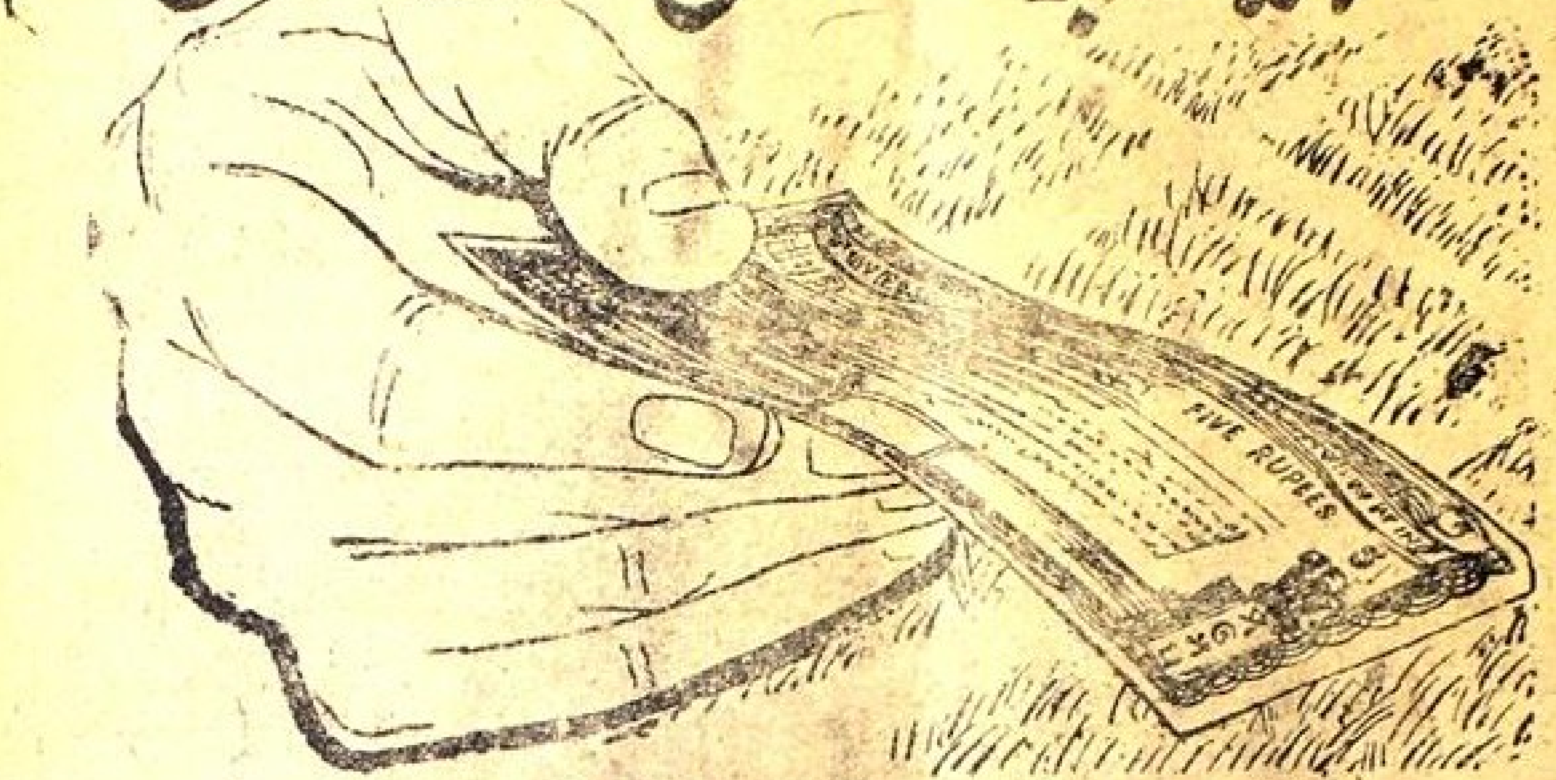

نارائن ایک سابق سپاہی ہے۔ بیرونِ سفر سے اس کا نقطۂ نگاہ وسیع ہو چکا ہے۔ اب وہ اپنی زمین کاشت کرتا ہے۔ اُسے خوب احساس ہے کہ دبا کے رکھا ہوا روپیہ بیکار ہے۔ وہ بچائے ہوئے سرمائے سے زیورات خریدنا بھی نامناسب اور غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ پچھلی دفعہ فصل بیچنے کے موقع پر وہ شہر سے ایک قومی پلان بچت سرٹیفکیٹ خرید لایا۔ اسے یقین ہے کہ اس میں لگایا ہوا روپیہ محفوظ ہے اور یہ اسے بمع سود (جس پر ٹیکس نہیں لگتا) واپس مل جائے گا۔ نارائن کے دیگر پڑوسیوں نے بھی اس کی سوجھ بوجھ سے سبق لے کر قومی پلان بچت سرٹیفکیٹ خریدنے شروع کر دیئے ہیں۔ ناموافق موسم، بیماری، ٹڈی، چوہے اور آگ وغیرہ سے اب انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتے۔

قومی پلان بچت سرٹیفکیٹوں اور چھوٹی بچت کی دُوسری سرکاری اسکیموں میں لگائے ہوئے روپے سے نہ صرف آپ کو بلکہ آپ کے دیش کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ اس روپے سے قومی ترقی اور توسیع کے کاموں میں بڑی اہم مدد ملے گی۔

بارہ سالہ قومی پلان بچت سرٹیفکیٹ

- ۵٫۴۱ فی صد سالانہ سود جس پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جائیگا
- یہ سرٹیفکیٹ ۵ روپے سے ۵۰۰۰ روپے تک کی مالیت کے ہر ڈاکخانے سے باآسانی خریدے جا سکتے ہیں
- یہ سرٹیفکیٹ حکومت ہند سے ضمانت شدہ ہیں۔

چھوٹی بچتوں کی دُوسری سرکاری اسکیمیں

۱۰ سالہ ٹریژری سیونگز ڈپازٹ سرٹیفکیٹ

پوسٹ آفس سیونگز بنک ڈپازٹ

قومی بچت آرگنائزیشن

مزید تفصیلات: اصول نیشنل سیونگز کمشنر ناگپور یا اپنے علاقے کے ریجنل نیشنل سیونگز آفیسر سے معلوم کیجئے

ملاحظات

مشرق و مغرب کے کردار کا فرق

اس وقت ہندوستان و پاکستان دونوں جس دور سے گزر رہے ہیں وہ کم و بیش ایک ہی سا ہے۔ انسانیت کا فقدان یہاں بھی ہے وہاں بھی، کردار و اخلاق کی خرابیاں دونوں جگہ ایک ہی نوعیت کی ہیں۔ اجتماعیت کا احساس نہ وہاں ہے نہ یہاں۔ سماج کی اصلاح نہ اُن کے پیشِ نظر ہے نہ ان کے۔ فرق اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ یہاں کچھ ایسے نفوس نظر آجاتے ہیں جن کو واقعی اِن کوتاہیوں کا احساس ہے اور وہاں کوئی ایک متنفس بھی ایسا نہیں جو لاشعوری طور پر کبھی کبھی یہ سوچتا ہو کہ قوم نام صرف اپنی ذات کا نہیں — مذہب کی غلط تعبیر کی لعنت میں دونوں مبتلا ہیں۔ سادھوؤں کے پاؤں دھو دھو کر پینا یہاں بھی بڑی عبادت ہے اور قبروں پر جا کر سجدہ کرنا وہاں بھی بڑا کارِ ثواب ہے۔ یہاں پراچین بھارت کا خواب دیکھا جا رہا ہے لیکن اُس عہد کی خوبیاں سامنے نہیں وہاں عہدِ اسلام کے قرونِ اولیٰ کا ذکر لبوں پر ہے لیکن بوبکر و عمر کا کردار کی طرف سے آنکھیں بند ہیں۔ یہاں قومی وحدت کا نعرہ زبان پر ہے اور دل ہندو مسلم تفریق سے معمور، وہاں دو قومی نظریہ ہے اور قومیت کا مفہوم ہی سرے سے مجہول ——— الغرض اخلاق و کردار کے لحاظ سے انسان نہ یہاں پایا جاتا ہے نہ وہاں۔ اور انسانیت کے مفہوم سے پاکستان و ہندوستان دونوں جگہ کی آبادی قطعاً ناآشنا ہے۔

یہ حقیقت کوئی ایسا راز نہیں جس کا علم مجھے پہلے سے نہ ہو، لیکن اس علم و احساس کی شدت سے بے چین ہوگیا، جب جون کا "ریڈرس ڈائجسٹ" میری نگاہ سے گزرا اور بے اختیار یہ جی چاہا کہ کاش کہ میں بھی کفرستان مغرب میں پیدا ہوتا اور میرا شمار بھی انھیں افراد میں ہوتا جنھیں یہاں "ناپاک، کافر اور ملحد" قرار دیا جاتا ہے۔

اوہائیو (امریکہ) جیل میں ایک قیدی (فرینک) بنک لوٹنے کے جرم میں طویل مدت قید بسر کر رہا ہے اور جیل کے پریس میں لینوٹائپ مشین پر کام کرتا ہے۔ ایک دن جیل کے اخبار میں شائع کرنے کے لئے ایک اعلان اسے کمپوز کرنے کے لئے دیا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے:-

"کینسر کی ریسرچ کے سلسلہ میں والنیٹروں کی ضرورت ہے"

جو قیدی اس پر آمادہ ہوں وہ تحریری رضامندی بھیجیں۔

قیدیوں کے خون میں کینسر کے زندہ جراثیم پچکاری کے ذریعہ سے پہونچائے جائیں گے اور اس عمل کے اثرات مابعد پر غور کیا جائے گا لیکن اس کے عوض میں قیدیوں کی میعادِ قید میں کوئی کمی نہ کی جائے گی"۔

فرینک یہ اعلان دیکھ کر کچھ دیر سوچتا رہا کہ اس نے کتنے انسانوں کو اس مرض میں مبتلا ہو کر جان دیتے دیکھا ہے اور پھر فوراً اس نے ایک مردانہ عزم کے ساتھ قلم ہاتھ میں لیا اور جیل کے وارڈن کو لکھا کہ "والنیٹروں میں سب سے پہلا نام میرا نام لکھ دیجیے"۔

ڈاکٹر چیسٹر (اس مہم کے سپروائزر) کا بیان ہے کہ "میرا اندازہ تھا کہ اس جیل سے زیادہ سے زیادہ ۲۵ والنیٹر مل سکیں گے، لیکن اس کے بعد جب وہ اس عمل کے لئے جیل پہونچا تو موت کی اس ہولناک دعوت قبول کرنے کے لئے ۱۳۰ قیدی صف بستہ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی عمریں ۲۳ اور ۵۷ سال کے درمیان تھیں اور ان میں نصف شادی شدہ تھے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ کیوں اس خطرناک تجربہ پر آمادہ ہوئے تو بعض نے کہا کہ ان کے فلاں فلاں عزیز اس مرض کا شکار ہو کر مر چکے ہیں اور وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس مرض کے ازالہ کیلئے اپنی قربانی پیش کریں۔ ایک نوجوان حبشی نے جو جیل کے اسپتال کا اردلی تھا کہا کہ میں نے اسپتال میں بہت سے کینسر کے مریضوں کی تیمارداری کی ہے اور ان کو دم توڑتے دیکھا ہے اس لئے میرے ضمیر نے مجبور کیا کہ اس سلسلہ میں جو خدمت مجھ سے ہو سکتی ہے اس سے گریز نہ کروں۔

اس کے بعد کی داستان بہت طویل ہے کہ اس تجربہ کا نتیجہ کیا ہوا؟ جس سے اسوقت ہم کو اس سے بحث نہیں ۔ مقصود تو صرف یہ دکھانا ہے کہ زندہ قوموں کا کردار کیا ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ سوال کرنا کہ کیا ہندوستان و پاکستان کی ۴۸ کرور آبادی میں کوئی ایک متنفس ایسا مل سکتا ہے جو افراد انسانی کی خدمت کے لئے ایسا دلیرانہ اقدام کر سکے ۔

ہندو مسلمانوں میں سب سے زیادہ نفس کشی کا دعویٰ کرنے والی جماعتیں دو ہیں ایک سادھوؤں کی، دوسری علماء وصوفیہ کی لیکن دوسروں کا کیا ذکر خود ان کی تمام ریاضت و مشقت کا تعلق بھی مابعد الطبیعیاتی دُنیا سے ہے، اس عالم آب وگل سے نہیں اس لئے وہ مُکتی اور حور وقصور کے لئے تو سب کچھ کر سکتے ہیں، لیکن بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے ایک پھانس کا چبھنا بھی گوارا نہیں کر سکتے ۔ پھر وہ قوم یا ملک جو خدمت انسانی کے صحیح جذبہ سے اس قدر عاری ہو کیا خاک ترقی کر سکتا ہے اور وہ کس منھ سے ان اقوام کے اخلاق وکردار پر نکتہ چینی کر سکتا ہے جن کی جرائم پیشہ جماعت میں بھی ایثار و قربانی کا وہ بلند جذبہ موجود ہے جو ہمارے یہاں بڑے بڑے رشی منی اور اولیاء کرام میں بھی مفقود ہے ۔ ہندوستان پراچین بھارت کا خواب دیکھے یا پاکستان قرون اولیٰ کا لیکن وہ اس وقت تک صحیح معنی میں انسانی آبادی نہیں کہلایا جا سکتا جب تک وہ مغرب کے ان بلند کردار کافروں اور ملکش افراد کا سا اخلاق پیدا نہ کر سکیں ۔

لبنان کے بعد عدن

لبنان کا مسئلہ روز بروز زیادہ پیچیدگی اختیار کرتا جا رہا ہے، کیونکہ موجودہ صدر شمعون مغربی طاقتوں کے زیر اثر رہنا چاہتے ہیں اور وہاں کی اکثر آبادی جمہوریت متحدہ عرب میں شامل ہو کر برطانوی اثرات سے علیحدہ ہو جانا چاہتی ہے ۔

شمعون چاہتے ہیں کہ بیرونی فوجی امداد سے قوم کے اس جذبہ کو دبا دیں اور سلامتی کونسل اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیکر فوجی مداخلت سے کام لے ۔ لیکن روس کے اس انتباہ نے کہ وہ سلامتی کونسل میں اس تحریک کی مخالفت کرے گا اور اگر بیرونی فوجیں لبنان میں داخل ہوئیں تو وہ کبھی خاموش نہ بیٹھا رہے گا، معاملہ کو زیادہ نازک بنا دیا ہے ۔

حالات بتاتے ہیں کہ یہ تحریک اتحاد و آزادی لبنان ہی تک محدود نہ رہے گی، بلکہ اس کے بعد ہی فوراً براہ یمن، سواحل عدن تک پہونچ جائے گی ۔ یمن جمہوریت عرب کا ممبر ہے اور ایک سال سے وہ عدن سے برسر پیکار ہے ۔ اس نے مصری اور روسی افسروں کے زیر تربیت دس ہزار فوج طیار کر لی ہے ۔ برطانیہ ان حالات کو بہت تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے کیونکہ اگر عدن اس کے ہاتھ سے نکل گیا تو سواحل عرب کے تمام وہ علاقے جو اس کے زیر اثر آزاد ہو جائیں گے اور اس طرح کویت، بحرین، قطار اور خلیج فارس کے تمام پٹرولی چشمے اس کے ہاتھ سے نکل جائیں گے ۔

چند نایاب کتابیں

دیوان اصغر گونڈوی = (للعہ) ـ دیوان جان صاحب = (سے) ـ کلیات میر تقی میر = (عـہ) ـ کلیات اکبر الہ آبادی ۳ حصے = (عـہ) ـ آفتاب داغ = (صہ) ـ انتخاب داغ = (للعہ) ـ مہتاب داغ = (عـہ) ـ یادگار داغ = (صہ) ـ بہار داغ = (للعہ) ـ گلزار داغ = (عـہ) ـ دیوان مجروح = (صہ) ـ دیوان امیر اللہ تسلیم = (سے) ـ دیوان قلق = (صہ) ـ صنمخانۂ عشق = (صہ) ـ کلیات نظیر اکبر آبادی = (صہ) ـ دیوان آتش (عـہ) ـ کلیات آتش = (عـہ) ـ نگارستان فارس = (عـہ) ـ شمیم سخن تذکرۂ شاعرات = (للعہ) ـ ہندو شعراء = (سے) ـ آب بقا = (صہ) ـ کلیات طیبات ـ مکتوبات = (عـہ) ـ فتوح الغیب = (عـہ) ـ فرہنگ جہانگیری ۲ جلدیں = (للعہ) ـ کشف اللغات قلمی = (صہ) ـ غیاث اللغات مع چراغ ہدایت = (عـہ) ـ کلیات عراقی = (عـہ) ـ کلیات جامی = (عـہ) ـ کلیات مرزا جلال اسیر = (عـہ) ـ تاریخ کشمیر (اعظمی) = (عـہ) ـ گلستان مسرت = (عـہ) ـ کلیات سودا = (عـہ) ـ

منیجر نگار، لکھنؤ

مومن کا تغزل

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

(ڈاکٹر عبادت بریلوی)

اردو غزل کے مختلف شاعروں کے یہاں عشقیہ شاعری کا آہنگ مختلف زمانوں میں پیدا ہوتا رہا، ان میں مومن کسی ایک طرف جھکتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ میر کے یہاں ہجر و فراق، مایوسی اور ناکامی نے جو فضا پیدا کی ہے، مومن اس سے بہت دور ہیں، جرأت کے یہاں جو معاملہ بندی اور کھل کھیلنے والا ماحول ہے، اس سے بھی انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ غالب کے یہاں تعیش پسندی، خواہش پرستی اور شاہد بازی نے جو حالات پیدا کئے ہیں، ان سے بھی وہ کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ بات یہ ہے کہ ان شعراء کے یہاں کسی نہ کسی حد تک انتہا پسندی ضرور ہے۔ مومن اس انتہا پسندی کے قایل نہیں ہیں۔ اسی لئے انھوں نے ان سب کے درمیان ایک راستہ نکالا ہے۔ ہجر و فراق، مایوسی اور ناکامی کا بیان وہ بھی کرتے ہیں لیکن اس راستے پر وہ بہت دور نہیں جاتے۔ انھیں اس کے باوجود زندگی کی مسرتوں اور دل آویزیوں کا احساس رہتا ہے۔ زندگی سے بیزاری ان کے یہاں نام کو بھی پیدا نہیں ہوتی۔ مایوسیوں اور ناکامیوں کے باوجود اسے برتنے اور لبسر کرنے کی چیز سمجھتے ہیں، لیکن برتنے اور لبسر کرنے کا مطلب وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ انسان آپے سے باہر ہو جائے اور ایسی حرکتیں کرنے لگے، جن کو کسی معاشرے میں بھی ذہنی طور پر صحت مند انسان کے شایان شان نہیں سمجھا جا سکتا۔ لذت کا احساس ان کے یہاں شدید ہے، لیکن وہ اس سلسلہ میں محض خواہش پرستی تک اپنے آپ کو محدود نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے پاس زندگی کی بعض اقدار ہیں جن کو وہ عزیز رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک خواہش پرستی تو مطلب برآری ہے اور کاروبار عشق میں ان کی کوئی ارفع حیثیت نہیں۔ وہاں تو اکتساب لذت کے لئے بہت سی چیزوں کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ اپنا سب کچھ تج دینا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کے یہاں ان سب پہلوؤں کے نہ ہونے کے باوجود یہ سب پہلو موجود ہیں۔ توازن کے احساس اور تناسب کے خیال نے انھیں ایک نئے روپ میں پیش کیا ہے۔ اسی لئے مومن کے تغزل میں سنبھلی ہوئی کیفیت نظر آتی ہے۔

ویسے معمولی طور پر دیکھا جائے تو عشقیہ موضوعات کی ترجمانی کرتے ہوئے جو فضا مومن کی غزلوں میں چھائی رہتی ہے، وہ جولانی اور مسرت کی فضا ہے۔ اس میں قدم قدم پر ایک نشاطیہ آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ مومن باوجود اپنی لذت پسندی کے کھل کھیلتے نہیں۔ چھیڑ چھاڑ کی طرف بھی راغب نہیں ہوتے۔ ہاتھا پائی اور چوما چاٹی سے بھی انھیں ایسی کچھ زیادہ دلچسپی نہیں، لیکن زندگی کی فطرتی مسرتوں سے سینہ بھر لینے کے لئے وہ ضرور طیار رہتے ہیں۔ اور انھیں ان تمام منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، جن سے ایک جسمانی، ذہنی اور جذباتی طور پر صحت مند انسان کو گزرنا چاہیے۔ مومن کی غزلیں ایک صحت مند انسان کے اس فطری رجحان کی بہت اچھی مثال پیش کرتی ہیں۔ ان اشعار کو دیکھئے۔ انسان کی اس رنگین دلاویز اور پرکیف دنیا کے کیسے کیسے لطیف پہلو ہیں جو ان تک اپنا جلوہ دکھاتے ہیں:۔

بات شب کو اس سے منع بیقراری پر بڑھی
ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا

کہنا پڑا مجھے پئے الزام پند گو
وہ ماجرا جو لائق شرح و بیاں نہیں

میں اپنی شوق چشم کو الزام ناک دوں
اس کی نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا
آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

اس بت کی ابتدائے جوانی مراد ہے
مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

آنکھیں جو ڈھونڈتی تھیں نگہ ہائے التفات
گم ہونا دل کا وہ میری نظروں سے پا گیا

ہر آن آن دگر کا ہوا میں عاشق زار
وہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے

روٹھے سو روٹھے ہم سے منتے نہیں ہو ہرگز
غیروں سے جب لڑے ہو لڑتے ہی من گئے ہو

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا،

بوئے گل کا اے نسیم صبح اب کس کو دماغ
ساتھ سویا ہے ہمارے وہ سمن بر رات کو

کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں
مجھے فکر جواب نے مارا

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم
بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف
دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی،
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا، وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یارب وصال یار میں کیونکر ہو زندگی
نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

کس کے ہنسنے کا تصور ہے شب و روز کہ یوں
گدگدی دل میں کوئی آٹھ پہر کرتا ہے

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آ جائے ہے
تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

اعجاز سے زیادہ ہے سحر اس کے ناز کا،
آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیاں نہ ہو

نہ کیونکر میں مٹا جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر
وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کر

مومن نے یہاں کاروبار شوق کی داستان رنگین کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ مومن پر ساری زندگی وہ جو ایک سرخوشی سی چھائی رہی، یہ اشعار اسی کے مرقع ہیں۔ ان میں انسانی رشتوں کا بیان ہے۔ اس کے لطیف معاملات کا تذکرہ ہے۔ ان میں آرزو کی دلفریبی اور تمنا کی دل آویزی ہے۔ ان میں جذب کا کمال اور شوق کا جمال ہے اسی لئے ایک نشاطیہ آہنگ کا احساس ان اشعار میں سب سے زیادہ ہوتا ہے کہیں کہیں محرومی کا احساس اور نامرادی کا خیال، جو درحقیقت انتہائے جذب و شوق ہی کی ایک منزل ہے، ان میں ایک لطیف سی خلش اور ایک پر کیف سی چبھن کو ضرور پیدا کرتا ہے۔ لیکن مومن ان معاملات کو پیش کرتے ہوئے بھی حزن و یاس کی فضا کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔ برخلاف اس کے لطیف اشاروں کنایوں میں اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں یہ معاملات نشاطیہ آہنگ کی تخلیق کے لئے ضروری ہیں۔ اس پس منظر کے بغیر اس کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ مومن کی غزلوں میں، تو انسانی دلچسپیوں کا اتنا سامان موجود ہے۔ مومن نے زندگی اور فن میں سوز و ساز دونوں کی اہمیت کو محسوس کیا ہے۔ وہ ان دونوں کے امتزاج کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اپنے تغزل میں صرف ایسے جذبات ہی کی ترجمانی نہیں کی ہے، جن کی نوعیت فطری ہونے کے باوجود بنیادی طور پر ہیجانی ہوتی ہے۔ انسان ان جذبات میں اپنے لطیف اور مہذب

احساس سے انسانیت کا رنگ ابھرتا ہے۔ مومن کے یہاں اس بنیادی حقیقت کا شعور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تغزل میں ان جذبات کی تہذیب کا احساس ہوتا ہے اور یہی خصوصیت ان کے تغزل کو مہذب بناتی ہے اس کو رفعت اور ترفع کے قریب تک پہونچاتی ہے اس خصوصیت نے مومن کے نشاطیہ آہنگ کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ مومن کسی جگہ کھل کھیلے نہیں۔ وصل اور متعلقات وصل کا تذکرہ ان کے تغزل میں موجود ہے لیکن اس کی مختلف منزلوں کا بیان اُن کے یہاں اس تفصیل سے نہیں ہوتا جو مذاق لطیف پر گراں گزرے۔ ویسے بنیادی طور پر باتیں وہی ہوتی ہیں، جن کو متعلقات وصل کہے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن مومن ان سب پر کچھ ایسے رنگین پردے ڈال دیتے ہیں جن سے اُن کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ یہی مومن کا کمال ہے۔ مومن کے تغزل میں برہنگی نہیں ہے، خوش پوشی ہے۔ عورت کا برہنہ جسم لذت کے خیال کو ضرور پیدا کرتا ہے لیکن وہ خوش منظر نہیں ہوتا۔ اس کے جسمانی تقاضوں کی تکمیل کا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے۔ احساس لطیف اور ذوق جسمانی کی تسکین کے لئے یہ برہنگی ضروری نہیں۔ اس کے لئے خوش پوشی لازمی ہے۔ اس خوش پوشی سے وہ جاذب نظر اور مرکز توجہ بنتا ہے۔ احساس لطیف اور ذوق جمال کی تسکین اس کے بغیر ممکن نہیں۔ مومن کی غزلوں میں عشقیہ معاملات کی ترجمانی کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ زندگی کی عام باتیں ہیں، لیکن مومن کے تغزل میں آ کر وہ جاذب نظر اور مرکز توجہ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح مومن کا تغزل احساس لطیف اور ذوق جمال کی تسکین کا باعث بنتا ہے۔ اس سے طبیعت بدمزہ نہیں ہوتی کیونکہ ابتذال اس میں نام کو بھی پیدا نہیں ہوتا۔

بات یہ ہے کہ مومن کے پاس اپنی تہذیبی قدروں اور معاشرتی معیاروں کا گہرا شعور ہے۔ وہ ان قدروں اور معیاروں کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کو نظر انداز کرنے کا انھیں خیال بھی نہیں گزرتا۔ ان تہذیبی قدروں اور معاشرتی معیاروں کی پاسداری نے ان کے یہاں ایک توازن کو پیدا کیا ہے۔ کیونکہ جس معاشرے، اور تہذیب کی پیداوار مومن تھے، اس میں لاکھ برائیاں ہوں لیکن ایک بات اس میں یقینی تھی۔ وہ یہ کہ اس کے پاس زندگی بسر کرنے اور برتنے کے کچھ معیار ضرور تھے۔ کچھ قدریں ضرور تھیں اور اس کا اثر یہ ہوا کہ باوجود اپنی کمزوریوں کے، افراد لئے دئے ضرور رہتے تھے۔ انھیں نیچے گرنا کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ وہ مبتذل نہیں ہو سکتے تھے۔ اُن کی زندگیوں میں بڑا ستھرا پن تھا اس کی جھلک مومن کے تغزل میں بھی نظر آتی ہے وہ عشقیہ معاملات اور کیفیات کی ترجمانی میں باوجود اپنی بے باکی کے نیچے نہیں گرے ہیں۔ مبتذل نہیں ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں جن عشقیہ معاملات اور واردات و کیفیات کو پیش کیا ہے، اُن میں مجموعی طور پر ایک بلندی نظر آتی ہے اور ایک وقار کا احساس ہوتا ہے۔ مومن کے یہاں سطحیت ضرور ہے لیکن سستا پن نہیں ہے۔ وہ سیدھی اور عام باتیں ضرور کرتے ہیں۔ لیکن اُن میں چھچھورپن نہیں ہوتا۔ مومن اُن کو پیش کرتے ہوئے بات میں بات ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی ہر بات ایک بانکپن کے ساتھ ہوتی ہے اور یہ بانکپن ان کی ہر بات کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ مومن نے اس انداز میں عشقیہ معاملات اور واردات و کیفیات کی ساری تفصیل پیش کی ہے۔ وصل، ہجر، چھیڑ چھاڑ، نوک جھونک، بوس و کنار، ناصح، رقیب نامہ بر، رشک رقیب ان سے متعلق بے شمار باتوں کو مومن نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ ان فرسودہ باتوں میں انھوں نے نئی زندگی کی ایک لہر دوڑا دی ہے ——— اسی لئے ان میں ہر جگہ جدت کی چمک دمک نظر آتی ہے۔ مومن کو بات کرنے کا ڈھنگ آتا ہے اور ان کی یہ خصوصیت روایتی موضوعات میں بھی جان ڈال دیتی ہے۔

مومن کے تغزل میں محبوب کا کردار خاصا نمایاں ہوتا ہے۔ کاروبار شوق کی ہر بات کا منبع یہی محبوب ہے۔ اس لئے مومن نے اس کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ وہ اس کو پری وش بتاتے ہیں۔ اُن کے خیال میں اس کو دیکھنا ناگزیر ہے، محبت کرنے والا ہر حال میں اس کو دیکھتا ہے۔ لیکن دیکھنے والے میں شرم و حیا بھی موجود ہے یہی شرم رسوائی کا باعث بنتی ہے۔ کیونکہ اس سے لوگوں کو محبت کا علم ہو جاتا ہے:-

مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا　　اُن سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی

مومن نے اس شعر میں حقیقت سے بھرپور بات کہی ہے، اور ایک بڑا ہی لطیف پہلو پیدا کر دیا ہے۔

یہ محبوب تندخو ہے - بات بات پر بگڑتا ہے - بگڑنا تو اُس کی عادت میں داخل ہے - یہ نازِ حسن کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے - مومن
بوب کے اس انداز پر حیران و پریشان رہ جاتے ہیں، اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جائے - ناچار پکار اُٹھتے ہیں :-

کچھ بھی بن آتی نہیں کیا کیجئے　　اُس کے بگڑنے نے کچھ ایسا کیا

مومن کا یہ محبوب عاشق صادق کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کرتا - وہ محفل میں جاتا ہے - چاہنے والے جمع ہوتے ہیں - فرداً فرداً
یک کا نام پوچھتا ہے تاکہ ہر ایک سے واقفیت ہو جائے - مومن خود اس محفل میں موجود نہیں ہیں - کیونکہ وہاں تو ان کے اُن کے ایسے
شق صادق کا گزر تو ممکن ہی نہیں جب انھیں محبوب کی محفل میں جانے کی خبر ملتی ہے تو بیٹھے ہی بیٹھے یہ خیال آتا ہے کہ اگر اس محفل میں
کا کوئی ہم نام نکل آتا تو لطف آجاتا - اس وقت محبوب کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے - دیکھنے والوں کو لطف ہی تو آجاتا ہے :-

ہر ایک سے اُس بزم میں شب پوچھتے تھے نام　　تھا لطف جو کوئی مرا ہم نام نکلتا

یہاں مومن نے شوخی کا بڑا ہی لطیف پہلو پیدا کیا ہے - اس شعر کا بنیادی موضوع تغزل کا روایتی موضوع ہے لیکن اس کے
جود مومن نے یہاں ایک نئی بات پیدا کر دی ہے -

محبوب کے ستم کبھی کم نہیں ہوتے - وہ غیر سے ملتا ہے اس سے ربط رکھتا ہے - عاشق صادق کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی
ن نے تغزل کے اس موضوع کو کیسے پہلو دار انداز میں پیش کیا ہے :-

کچھ غیر سے ہونٹوں میں کہے ہیں یہ جو پوچھو　　تو وہ ہیں مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اس میں محبوب کی شوخی بہت نمایاں ہے - مومن نے محبوب کی اس شوخی کی جگہ جگہ وضاحت کی ہے - یہ ناز و شوخی تو
ت تظلم بھی اپنا کام کرتی رہتی ہے - مومن اسی لئے تو اپنے محبوب کو عذر جفا کے وقت بھی جھنجلاتے ہوئے دیکھتے ہیں :-

ناز و شوخی دیکھنا وقت تظلم دم بدم　　مجھ سے وہ عذر جفا کرتا تھا اور جھنجلائے تھا

لیکن ان خصوصیات کے باوجود مومن اپنے محبوب کو بہت عزیز رکھتے ہیں - چنانچہ جہاں کہیں اس کا تذکرہ ہوتا ہے وہ وہیں کے
رہ جاتے ہیں ناصح اُن کے تغزل کا ایک اہم کردار ہے - بظاہر اس ناصح سے انھیں دلچسپی نہیں ہونی چاہئے - لیکن جب وہ یہ دیکھتے ہیں
صح نصیحت کے وقت تذکرہ یار بھی کرتا ہے تو وہ اس اجتناب کو دور کر کے ناصح سے دلچسپی لینے لگتے ہیں -

کیا جی لگا ہے تذکرۂ یار میں عبث　　ناصح سے مجھ کو آج تلک اجتناب تھا

مومن کا محبوب خاصا تیز طرار ہے - کبھی پوچھ بیٹھتا ہے کہ کس پہ مرتے ہو - اس پر بیچارے، مومن جیسے عاشق سے کچھ بن نہیں پڑتا
لہ ایک تو جواب دینے کی ہمت نہیں پڑتی دوسرے، وہ یہ سوچتا ہے کہ محبوب کو تو ساری حقیقت کا علم ہی ہے - پھر بھلا وہ جواب
ے اس کے ذہن میں ایک اُلجھن اور کشمکش شروع ہو جاتی ہے - مومن نے اس خیال کو کس خوبی سے پیش کیا ہے :-

کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں　　مجھے فکر جواب نے مارا

مومن کو ہمیشہ اس بات کی فکر رہتی ہے کہ کہیں اُن کے عشق کا راز کھل نہ جائے - اسی لئے وہ محبوب تک سے یہ کہتے ہیں کہ محفل میں
ا نہ کرنا کہ میری طرف نہ دیکھو - کیونکہ نہ دیکھنے سے تو غیروں پر رازِ محبت کھل جائے گا - وہ فوراً تاڑ لیں گے اس میں ایک حسن طلب بھی
- بہرحال ایک پر لطف کیفیت ہے :-

غیر دل پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا　　میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

محبوب مومن کو مختلف طریقوں سے ستاتا ہے - ایک ستانے کا طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ اُسے آزماتا ہے - حالانکہ اُن کا آزمانا کوئی معنی نہیں
ا - کیونکہ انھیں تو بارہا آزمایا جا چکا ہے - اسی لئے وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ یہ آزمانا ضرور ستانے کا عذر ہے :-

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو　　عذر کچھ چاہئے ستانے کو

محبوب کی حرکتیں بھی عجیب ہوتی ہیں - محبوب ہی ہے اس کا کوئی کیا کر سکتا ہے - غفلت شعاری اس محبوب کے مزاج میں داخل ہے غفلت شعاری اس کی عادت ہے - اگر کبھی اس سے باز آتا ہے تو جفا کرنے پر تل جاتا ہے - اس لئے مومن اس سلسلہ میں عجیب صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں :-

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی　　تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

ظاہر ہے رقیب اور عدو سے عاشق صادق کو بیر ہونا چاہئے - مومن کو بھی اس سے خدا واسطے کا بیر ہے - اگر کوئی محبوب کے ساتھ وصل عدو کی خبر سناتا ہے تو وہ اس خبر کو سنکر پریشان ہوتے ہیں، اور محبوب سے اس کا ذکر کرتے ہیں لیکن وہ قسم کھانے پر طیار ہو جاتا ہے

جاں دکھا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں　　جب گلا کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

غرض ان موضوعات کی تفسیر کہاں تک پیش کی جائے مومن نے شاید ہی عشق و عاشقی کی دنیا کا کوئی موضوع چھوڑا ہو - اپنے مخصوص انداز میں ان گنت معاملات اور واردات و کیفیات کی ترجمانی انھوں نے کی ہے - ان کو دیکھ کر اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ مومن کے یہاں اس سلسلہ میں کوئی فکری گہرائی پیدا نہیں ہو سکی ہے - ان سب میں ہلکا پھلکا پن ہے - لیکن زندگی اور جولانی، رنگینی اور رعنائی کا احساس ضرور ہوتا ہے - یہی خصوصیات مومن کے تغزل کی مخصوص فضا کو پیدا کرتی ہیں -

جیسا کہ اس سے قبل بھی اشارہ کیا جا چکا ہے مومن کے تغزل میں ان کے تہذیبی شعور نے بڑا کام کیا ہے - ان کے تغزل کی ستھری لیکن رنگین فضا اسی تہذیبی شعور کی پیداوار ہے - تہذیب کی جو روایت ان تک پہونچی تھی، اس سے انھوں نے بڑا فایدہ اٹھایا ہے - لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مومن اپنے ماحول کے فرد تھے، اور ماحول کی اس وقت جو کیفیت تھی اس کے اثر سے ان کا دامن بچانا مشکل تھا - ان کے ماحول میں محبوب بازاری تھا - میر کے سے گھریلو عشق کی گنجائش اس وقت نہیں رہی تھی مومن کے زمانے میں ہر طرف شاہدانِ بازاری کے عشق کے چرچے تھے، پھر بھلا ان کا دامن ان باتوں سے کس طرح بچ سکتا تھا جو اس دنیا میں ہوتی تھیں - چنانچہ عشق و عاشقی کے معاملات کو پیش کرتے ہوئے ان اثرات کی جھلک ان کے یہاں ضرور پیدا ہو جاتی ہے - یوں مومن عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں اور بار بار اس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں - لیکن ان کے تغزل میں رقیب کا ذکر بار بار آتا ہے رشک کا بیان وہ کسی نہ کسی طرح ضرور کرتے ہیں ——— ان کی غزلوں کا خاص حصہ ان موضوعات سے متعلق ہے - یہ رقیب اور رشک کا خیال بازاری محبوب کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا - یہ اسی بات کا واضح ثبوت ہے کہ مومن نے جس محبوب کا تذکرہ اپنے تغزل میں کیا ہے، وہ بازاری ہے - لیکن بازاری محبوب سے دلچسپی لینے کو اس زمانہ میں عیب نہیں سمجھا جاتا تھا - مومن نے اس صورت حال کی ترجمانی کی ہے - ویسے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ رشک اور رقیب کے خیال کو کسی حد تک ان کی خود پرستی نے بھی ابھارا ہے - بہر حال رشک اور رقیب کے موضوعات کی مومن کے یہاں فراوانی ہے - لیکن مومن ان موضوعات کو پیش کرتے ہوئے بھی لئے دئے رہے ہیں انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا ہے ان کے قدم ڈگمگائے نہیں ہیں - ان سے لغزش نہیں ہوئی ہے - کیسے ستھرے شعر انھوں نے اس موضوع پر نکالے ہیں :-

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل　　میں کوچۂ رقیب میں سر کے بل گیا

کرتے جو مجھے یاد شبِ وصل عدو تم　　کیا صبح کو خورشید نہ تا شام نکلتا

میرے کوچے میں عدو مضطر و ناشاد رہا　　شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا

بے پردہ غیر سے نہ ہوا ہوگا شب کو صبح　　آنکھوں میں شرم تھی نہ نظر میں حجاب تھا

صورتِ اغیار کو دیکھے ہے وہ حیرت زدہ　　میرے رنگ رخ نے آئینہ مگر دکھلا دیا

رازِ نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہونچا　　کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہونچا

میرا گلا ہنسی سے نہیں گھونٹتے تھے وہ — کیا سوچ کر رقیب خوش آیا، خفا گیا
خار و خس میں گلشن کے بوئے گل جو آئی تھی — رشک سے کیا برباد آپ آشیاں اپنا
شکوہ آزارِ غیر کا جو کروں — ہنس کے کہتا ہے وہ کہ ہاں افسوس
غیر ہے بے وفا، تم تو کہو — ہے ارادہ نباہ کا کب تک
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم — منھ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم
خط غلط لکھ دے غیرت تو بھی گلہ کیا لکھئے اب — چھیڑ تو دیکھو میرا خط وہ غیروں سے پڑھواتے ہیں
غیر سے اب وہ گرم صحبت ہے — کیوں نہ غیرت کرے کباب ہمیں
یہ ستم کیا غیر پر کرنا وہ سچ پوچھو تو ہے — یار کے ناز بجا سے شکوۂ بے جا ہمیں
ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں
غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ — آرزو ہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں
کیسے گلے رقیب کے کیا طعنِ اقربا — تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں
اس کو بھی جانتا ہوں فریبِ وصالِ غیر — تم کو عبث یقیں ہے کہ میں بدگماں نہیں
ذکرِ رشکِ غیر میں رنگینیاں — بوئے خوں آئی تری گفتار سے
کیا ہو گئی خود بینی اب غیر پہ جو چشمک ہے — یا خوش نگہی وہ کچھ یا بد نظری اتنی
غیر سے بے حجاب ملتے ہو — شبِ عاشق سحر نہ ہو جائے
کہا ہے غیر سے تم نے مرا حال — کہے دیتی ہے بے باکی ادا کی
نا رشک اس سے زیادہ آسماں سے — جفا بہرِ عدو لاؤں کہاں سے
لے دشمن سے کیونکر بے حجاب آپ — نہ شرم آئی مرے شوقِ نہاں کی

مومن نے ان اشعار میں غیر اور عدو رشک اور رقیب اور ان سے متعلق معاملات کی ترجمانی مختلف زاویوں سے کی ہے۔ لیکن اس موضوع کی پستی کے باوجود مومن نے اس میں سستا پن پیدا نہیں ہونے دیا ہے۔ مومن یہاں بھی لئے دیئے رہتے ہیں یہاں وقار اور رکھ رکھاؤ کی خصوصیت ان کے دم کے ساتھ رہی۔ یہ حقیقت ہے کہ رقیب ان کے ذہن پر ضرورت سے زیادہ ہی سوار رہتا ہے اس میں حقیقت ضرور ہے لیکن کچھ ان کی ذہنی کیفیت بھی اس کا باعث بنی ہے۔ بہرحال رقیب کا خیال مومن کے یہاں چھایا ہوا ہے۔ لیکن اس سے ان کے جذب و شوق کو ٹھیس نہیں لگتی محبوب کے ساتھ ان کا خلوص بہر صورت باقی رہتا ہے کیونکہ محبوب چاہے کچھ بھی کرے۔ وہ اس کے ساتھ جذب صادق رکھتے ہیں اس موضوع میں سستا پن سہی لیکن مومن خود اپنے آپ کو اس سستے پن کا شکار نہیں ہونے دیتے نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اس محبوب کی خاطر کوچۂ رقیب تک میں سر کے بل جانے کو طیار ہو جاتے ہیں۔ رقیب ان سے زیر نہیں ہوتا محبوب کے ساتھ ان کا ربط باقی رہتا ہے۔ ان حالات کو دیکھ وہ بیکسی کے عالم میں روتے رہتے ہیں ان کے پاس سوائے اس کے اور چارہ ہی نہیں رہتا۔ لیکن وہ ان حالات سے دوچار ہونے کے باوجود راہ شوق کے مسافر ہی رہتے ہیں ان کے قدم ڈگمگاتے نہیں۔ ان سے لغزش نہیں ہوتی۔ مومن کے عشق میں اس وجہ سے ایک استواری کا احساس ہوتا ہے۔ ایک صداقت نظر آتی ہے چنانچہ انھیں ان تمام منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے جن سے جذب و شوق کی دنیا کے ایک سچے اور پر خلوص انسان کو گزرنا پڑتا ہے۔

مومن کے تغزل میں اسی لئے تو ایسے موضوعات کی ترجمانی بھی ملتی ہے جس کا وجود عشق کے اعلیٰ معیار اور بلند قدروں کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ان موضوعات کو عشق کی سپردگی ہی پیدا کر سکتی ہے۔ ایثار اور قربانی کی فضا ہی میں ان کا وجود ہو سکتا ہے، مومن

چونکہ جذبِ صادق رکھتے ہیں اس لئے انھوں نے اپنی غزلوں میں ایسے بلند موضوعات کو بھی جگہ دی ہے جن سے ان کا تغزل رفعت اور ترفع سے ہم آہنگ ہوتا۔ میر کا تغزل اس کا سب سے اچھا نمونہ ہے۔ مومن نے بھی کہیں کہیں ایسے اشعار کہے ہیں، جن میں میر کے خلوص بے پایاں کے جذبِ صادق اور شوقِ فراواں کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہ اشعار ان خصوصیات سے کتنے بھرپور ہیں۔

کیا روؤں خیرہ چشمیِ بختِ سیاہ کو
واں شغلِ سرمہ ہے ابھی یاں نیل ڈھل گیا

اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

خبر نہیں کہ اُسے کیا ہوا پر اس در پر
نشاں پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

کیونکہ امید وفا سے ہو تسلی دل کی
فکر ہے یہ کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا

کچھ قیس اور میں ہی نہیں سب کے سب ہوئے
اچھا تو دردِ عشق کا بیمار کم ہوا

کانٹا سا کھٹکتا ہے کلیجے میں غمِ ہجر
یہ خار نہیں دل سے گل اندام نکلتا

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم
بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

وہ ہنسے سن کے نالۂ بلبل کا
مجھے رونا ہے خندۂ گل کا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کیا گل کھلے گا دیکھئے ہے فصلِ گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا،
کیوں اپنے دل کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو
کہیں دامان تر نہ ہو جائے

اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ
تو ایک ایک کے منہ کو تکا نہ کرتے ہم

جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بلا
وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں
ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

دن میں دراز رات بھی کیوں ہے فراقِ یار میں
کاہے سے فرق آ گیا گردشِ روزگار میں

صبحِ عشرت ہے وہ نہ شامِ وصال
ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

تم اٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا
سائے سے مرے وحشت اے رشکِ پری اتنی

وصل کی بات کب بن آتی تھی
دل سے دفتر بنائے لوگوں نے

شبِ فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں
کہ گو خوشی نہیں مرنے کی پر ملال تو ہے

مومن کے عشق کی یہی وہ منزلیں ہیں جہاں حسن کی ناز آفرینی کی جگہ عشق کی نیاز آگینی غالب آجاتی ہے۔ نیاز عشق کی بلندی اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ مومن شبِ فراق میں بھی زندگی پر مرتے ہیں۔ انھیں شبِ ہجراں کو کاٹنا منظور ہے لیکن وہ اس عالم میں محبوب کو بلا کر اپنے حالِ تباہ میں شریک کرنا نہیں چاہتے، ہجر کی شبِ دراز میں کمی کا خیال بھی انھیں ناپسند ہے۔ کیونکہ انھیں اسی کے ساتھ یہ بھی تو خیال گزرتا ہے کہ اس سے محبوب کے خوابِ ناز میں خلل پڑے گا امید وفا سے اُن کے دل کو تسلی نہیں ہوتی کیونکہ انھیں تو یہ فکر دامنگیر رہتی ہے کہ محبوب کو اس وعدے کے وفا نہ کرنے کی صورت میں پشیمانی کا سامنا کرنا ہوگا۔ ان تمام باتوں سے

اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ مومن جذبِ صادق خلوصِ بے پایاں اور شوقِ فراواں رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں میر کی سی بات تو خیر انھیں کیا نصیب ہو سکتی تھی۔ ہاں وہ اس سے قریب تک ضرور پہونچ جاتے ہیں۔ مومن کی غزلوں میں ایسے ہی مقامات پر ایک میٹھے میٹھے درد اور ایک ہلکی سی کسک کا احساس ہوتا ہے ——— اور یہی تغزل کی وہ بنیادی خصوصیت ہے جو اگر کسی شاعر کی غزل میں نہ ہو تو اس کو جی ڈھونڈتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر دلچسپی کا سامان تو فراہم کر سکتی ہے۔ بعض جذبات اس سے آسودہ تو ہو سکتے ہیں لیکن اسے تیرِ نیم کش کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا جس کا دل میں اُتر جانا ہی ایک بے نام سی لذت کا باعث بنتا ہے۔ مومن کے تغزل میں اُس تیرِ نیم کش کی خلش موجود ہے جو جگر کے پار نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کی غزلوں میں ایسے لوگوں کی دلچسپی کا خاصا سامان ملتا ہے جو زندگی کی ایک خاص منزل سے دوچار ہونے کے بعد خود اپنے دل کو بھی کچھ اجنبی سے لگتے ہیں۔

مومن کی غزلوں میں نازِ حسن، نیازِ عشق اور اس کی ساری تفصیل موجود ہے اور اس تفصیل کو پیش کرتے ہوئے مومن نے گہرے نفسیاتی شعور کا اظہار کیا ہے۔ اسی لئے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ جو باتیں وہ کرتے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنی ہی باتیں ہیں، کیونکہ مومن نے ان کو گہرے نفسیاتی شعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مومن خود حسن و عشق کی مختلف منزلوں سے گزرتے ہیں۔ اس لئے اس کی نفسیات کا انھیں عملی طور پر تجربہ ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی غزلوں میں ان تجربات کے نشیب و فراز ملتے ہیں۔ مومن نے ان میں ذاتی رنگ اور شخصی آہنگ ضرور پیدا کیا ہے، لیکن صرف اپنی انفرادیت کو اُبھارنے کی حد تک ویسے مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جن معاملات اور واردات و کیفیات کی ترجمانی انھوں نے اپنی غزلوں میں کی ہے، ان کا اطلاق ہر انسان پر ہوتا ہے۔ اسی لئے ان میں ایک آفاقیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور یہ مومن کے صحیح نفسیاتی شعور کا نتیجہ ہے اس نفسیاتی گہرائی کے پیدا ہونے ہی کا یہ اثر ہے کہ مومن عام انسان کے جذبات و احساسات، واردات و کیفیات اور معاملات و مسائل میں زیادہ دلچسپی لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی لئے عشقیہ موضوعات کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی میں اُن کے یہاں فکر کی گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔ کسی فلسفیانہ آہنگ کا احساس نہیں ہوتا۔ فکر و فلسفہ مومن کے مزاج ہی میں نہیں تھا۔ پھر بھلا اُن کی غزلوں میں کہاں سے آتا؟

مومن کے یہاں خالص تغزل ہے، اور ان کی غزلیں تغزل کے اسی آہنگ سے پہچانی جاتی ہیں جس میں برگِ گل پر شبنم کے گرنے کا سا انداز ہوتا ہے۔ مومن اسی مخصوص انداز اور منفرد آہنگ کے شاعر ہیں۔

اس مخصوص انداز اور منفرد آہنگ نے مومن کے تغزل کو جمالیاتی اعتبار سے ایک نئے سانچے میں ڈھالا ہے۔ یہ جمالیاتی اظہار اور اس کا نیا سانچہ مومن ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کے یہاں اس جمالیاتی اظہار میں نہ تو میر کی سادگی اور آہستہ روی ہے، نہ غالب کی سی تندی اور پرکاری۔ انھوں نے تو ان دونوں کے امتزاج سے ایک تیسرا اسلوب پیدا کیا ہے۔ اس اسلوب میں ان دونوں پہلوؤں کا ایک حسین اور متوازن امتزاج ہے۔ جس نے مومن کے تغزل کو جمالیاتی اعتبار سے زیادہ دل نشیں اور دلآویز بنا دیا ہے۔ مومن کے تغزل میں نہ تو نری داخلیت ہے نہ نری خارجیت۔ ان دونوں پہلوؤں کو بھی انھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ وہ ان میں سے کسی ایک طرف نہیں جھکتے۔ اسی لئے ان کے تغزل میں ان دونوں پہلوؤں کا سنگم نظر آتا ہے۔ مومن بیچ کا راستہ نکالنا خوب جانتے ہیں۔ توازن ان کے مزاج میں داخل ہے۔ اسی لئے وہ ایک اسلوب کو پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے تغزل میں یہ صلاحیت ہر جگہ کام کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

....

.... اس صلاحیت کا یہ اثر ہے کہ ان کے تغزل میں جمالیاتی اعتبار سے ایک نیا اسلوب اپنے آپ کو رونما کرتا ہے۔ مومن بات بات میں پہلو پیدا کرتے ہیں۔ ہر خیال کو جدتِ ادا کے ساتھ بڑے سلیقے سے ظاہر کرتے ہیں ...

.... کبھی یہ جدت ان کے یہاں نئے اشاروں اور کنایوں کے سہارے پیدا

ہوتی ہے کبھی الفاظ کی نئی معنویت کے سہارے اس کا وجود ہوتا ہے۔ کبھی ایک پرپیچ اندازِ بیان کے سہارے اس کی تخلیق ہوتی ہے۔ کبھی ایک مخصوص لہجہ اس کو ابھارتا ہے۔ غرض یہ کہ مومن مختلف وسیلوں سے اپنے لئے جمالیاتی اظہار و بیان کے راستے نکالتے ہیں۔ مومن کے تغزل میں فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک شگفتگی، ایک جولانی، ایک شیرینی اور ایک گھلاوٹ کے امتزاج کا احساس ہوتا ہے۔ کہیں کہیں طنز کی تیزی اور زہرناکی بھی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ لیکن اس کو بھی وہ تیز نہیں ہونے دیتے کہ اس کی مجموعی فضا کو ٹھیس لگے۔ اس لئے اس میں نرمی گھلاوٹ بہر صورت باقی رہتی ہے۔ نرمی اور گھلاوٹ نہ ہو تو غزل کا فن اپنی آب و تاب کھو بیٹھتا ہے۔ مومن کو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ اس لئے وہ اس سے جس طرح چاہتے ہیں کام لیتے ہیں۔ فارسی کے رچے ہوئے مذاق نے بھی انھیں اس سلسلہ میں بڑا سہارا دیا ہے۔ انھوں نے نئی نئی فارسی ترکیبوں سے اپنے تغزل کی دنیا میں رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں۔ مومن کا تخیل بھی بلا کا رنگین اور پرکار ہے۔ اور یہ رچاؤ ان کے فن کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ مومن کے تغزل میں ان کا مخصوص لہجہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس مخصوص لہجہ نے ان کے اسلوب اور طرزِ ادا میں بڑی ہی ندرت پیدا کر دی ہے۔ ایسے اشعار کی تخلیق مومن ہی کر سکتے ہیں :-

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم　　بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر　　ولولہ کیا نالہ کیا فریاد کیا

کچھ نہیں نظر آتا آنکھ لگتے ہی ناصح　　گر نہیں یقیں حضرت آپ بھی لگا دیکھیں

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ　　آرزو ہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

شکوہ نہیں غیر کے ستم کا　　انصاف کرو تو میں کیا ہوں

مجھ رمز شناس سے یہ باتیں　　کیا خوب میں غیر سے بُرا ہوں

جاں نہ کھا وصلِ عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں　　جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

لو چھیڑے ہے نکہت کو گل ہائے شبینہ کی　　اب تم سے بھی چل نکلی بادِ سحری اتنی

یہ کون کہے اُس سے کی ترک وفا میں نے　　کرنی ہے ذرا ناصح پیغام بری اتنی

کہتا ہے مرے آگے وہ مجھ پہ عدو غش ہے　　ہے ہے مری اُلفت سے ہے بے خبری اتنی

میں اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں　　تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

خاک اڑائی گل نے یہ کس کے جنونِ عشق میں　　آتی ہے کچھ اڑی ہوئی بادِ صبا غبار میں

دعوئے حسن جہاں سوز اس قدر　　پھر کہو گے تم میں ہرجائی نہیں

ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا　　انصاف کیجے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

نہ کیونکر بس مرا جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر　　وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

وہ ہنسے سن کے نالہ بلبل کا　　مجھے رونا ہے خندۂ گل کا

نالۂ شب نے یہ ہوا باندھی　　ہو گیا گل چراغ بلبل کا

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے　　اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

ہوں کیوں نہ محوِ حیرت نیرنگی ہائے شوق　　جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آب تھا

سر سے شعلے اٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جائے ہے　　شمع سے یہ کس نے ذکر اس محفل آرا کا کیا

یہاں ایک مخصوص لہجے اور لے نے اسلوب اور طرزِ ادا میں جو ندرت پیدا کی ہے، وہ غزل کے فن کی جان ہے۔ ان اشعا

اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ مومن کے فن میں سادگی اور سلاست کے طرحداری اور بانکپن بھی ہے - رمز و ایما بھی ہے رنگینی اور پرکاری بھی ہے - لیکن ان خصوصیات کو صرف الفاظ ہی نے پیدا نہیں کیا ہے - اس میں ان کے تخیل کی سحرکاری کو بہت بڑا دخل ہے جس نے مومن کے فن کو بھی گل و گلزار بنا دیا ہے - بہرحال مومن کے تغزل میں جمالیاتی اعتبار سے جدت اور اپج نظر آتی ہے انھوں نے غزل کے بنیادی مقتضیات سے کام لے کر ایک نئے اسلوب کی تشکیل کی ہے جو نہ صرف اس کے لئے بلکہ خود غزل کے لئے بھی باعث فخر و افتخار ہے -

مومن کی انفرادیت اسی اسلوب میں جھلکتی ہے اسلوب کی اسی انفرادیت نے انھیں ایک اچھا اور اعلیٰ درجے کا غزل گو شاعر بنایا ہے - ان کے پیش کئے ہوئے موضوعات میں کوئی خاص تنوع نہیں - کسی قسم کی گہرائی کا بھی اس میں پتہ نہیں چلتا کسی طرح کی وسعت بھی اس میں نظر نہیں آتی - ان کا موضوع محدود ہے لیکن محدود موضوع میں انھوں نے وسعت اور تنوع کو پیدا کیا ہے - ان کے یہاں رنگا رنگی ہے - تفکر ان کے بس کی بات نہیں - وہ تو صرف محسوسات کے شاعر ہیں - اسی لئے ان کے یہاں مفکرانہ گہرائی اور فلسفیانہ عظمت کو تلاش کرنا بے کار سی بات ہے - انھوں نے تو زندگی کے عام معاملات کی شاعری کی ہے - ان کا میدان انسانی جذبات ہیں - ان کے تغزل میں انہی بنیادی انسانی جذبات کی ترجمانی ہے - اس ترجمانی کا اُن کے یہاں کمال نظر آتا ہے - اس ترجمانی میں محسوساتی رنگ و آہنگ نے اُن کے تغزل کو چار چاند لگا دئیے ہیں - اسی میں اُن کی انفرادیت کا راز ہے - اس اعتبار سے اُردو غزل کی روایت میں اُن کا کوئی ثانی نہیں!

(اُردو)

گلہائے پریشاں

آراستہ الیاس احمد (رٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج)

ضخامت ۵۰۸ صفحات - تقطیع بڑی - قیمت سات روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ :- کتابستان - الہ آباد

"گلہائے پریشاں" فارسی اور اُردو ... کے چوٹی کے کلام کا بہترین گلدستہ ہے - آغاز عشق تک کے جتنے مرا... پیش آتے ہیں اُنکے متعلق سرخیاں قایم کی گئی ہیں اور چیدہ چیدہ منت... مضامین اشعار ہر سرخی کے تحت میں تقدم و تاخر کے لحاظ سے درج ہی... مراحل محبت کی سرخیوں کے علاوہ خمریات، مذہبیات، اخلاقیات وغیرہ ... متعلق بھی سرخیاں قایم کی گئی ہیں اگر کسی شخص کے متعلق کوئی لطیفہ ہے ... وہ بھی درج ہے - اساتذہ سابق کی تیس تصویریں بھی کتاب میں ... شامل ہیں - اردو ادب میں یہ کتاب ایک دلکش و دلفریب ... اضافہ ہے اہلِ ذوق ... ملاحظہ فرمائیں - "شنیدہ کے ... مانند دیدہ"

رعایتی اعلان

من و یزداں - مذہبی استفسا... ۸ ؍
جمالستان - مکتوبات نیاز ... ۸ ؍ ۱۲ ؍
مذہب - حسن کی عیاریاں - مجموعہ استفسار و جواب جلد سوم ؍ ۲ ؍ ۳ ؍
قول فیصل - شہاب کی سرگزشت ۲ ؍ ۲ ؍
نقاب اُٹھ جانے کے بعد ۸ ؍
...ت و جوابات - نگارستان ؍
... ئے - مالہ وما علیہ ۲ ؍
... - فراست الید - ؍
میزان ۵۲ ؍
یہ تمام کتابیں یکساتھ طلب کرنے پر صرف پینتالیس روپے ...

فلاسفہ کا تصوّرِ الٰہ

(بہ سلسلہ ماہ مئی ۵۸ء)

یہودی فلاسفہ

(نواب) محمد عباس طالب صفوی

تمہید - ہمارے زمانہ کے رجحان کے مطابق اس حقیقت کے بعد بھی کہ ارسطو نے قریب العہد ہونے کے باوجود فیثا غورث کے تاریخی وجود سے انکار کیا تھا[1] - پروفیسر برٹرنڈ رسل نے نہ صرف فیثا غورث کے تاریخی وجود کا اقرار کیا بلکہ فیثا غورث سے قبل کے فلاسفہ کے وجود کو بھی موہوم نہیں سمجھا .... لیکن ان فلاسفہ کے برعکس مذہب کے رہنماؤں کے تاریخی وجود کو کبھی یہ کہکر مشکوک ٹھہرایا کہ اگر کنفوشس - جہاتما بدھ اور جناب زرتشت کا کوئی وجود تھا تو وہ لوگ بھی اس چھٹی صدی قبل مسیح میں موجود ہوں گے[2] اور کبھی یہ ارشاد فرماکر موہوم بنایا کہ حضرت داؤد اور جناب سلیمان کو بتکلف ایسا بادشاہ کہا جا سکتا ہے جن کا شاید تاریخی وجود ہو[3] - لیکن اس ارشاد کے فوراً بعد اسی صفحہ ۳۲۹ پر یہ بھی تسلیم کہ عہد نامۂ عتیق میں جن افراد کا ذکر ہے اُن میں سے وہ ... شخص جس کا ذکر عہد نامۂ عتیق کے علاوہ کہیں اور بھی ہو بنی اسرائیل کا ... بادشاہ احاب ہے جس کا تذکرہ ۸۵۳ء قبلِ مسیح کے ایک ... خط میں ہے یعنی بالفاظ دیگر خود پروفیسر موصوف کو اعتراف کہ ... نامۂ عتیق - لے کم از کم ایک بادشاہ کا تاریخی وجود یونانی ... کے پہلے فلسفی طالیس سے بھی سیکڑوں برس قبل تھا۔

عہدِ حاضر کے ایک اور فلسفی ڈاکٹر لیون راتھ پروفیسر ... عبرانی یونیورسٹی یروشلم کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ اگرچہ حضرت یرمیاہ کا ارشاد ارسطو کے تصانیف میں بھی تقریباً انھیں الفاظ میں ملتا ہے، تاہم یہ ظاہر ہے کہ حضرت یرمیاہ، ارسطو سے پہلے گزرے ہیں[4]۔

ظاہر ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل کی قدامت کا یہ خیال متقدمین یہود کے نزدیک یقین کی صورت رکھتا تھا اور اسی یقین کے تحت دوسری صدی قبلِ مسیح کے یہودی فلسفی ارسٹوبولوس نے یونانی فلسفہ سے واقف ہونے اور بعض مسایل میں فلاسفہ کا ہم نوا ہونے کے ... اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ آرفیس - ہومر - فیثا غورث ... افلاطون کے نظریات و افکار یہودیوں کی مقدس کتابوں سے

Metaphysics" page 64

A History of Western Philosophy page 31

Ibid page 329

The Guide for the Perplexed: Moses Maimonides by Dr. Leon Roth page 82

ماخوذ میں[1] اور ارسٹو بولوس کے اس خیال سے متاثر ہو کر نہ صرف یہودی فلاسفۂ یونان کی تعلیم کو اپنے کتبِ مقدسہ کا رہینِ منت سمجھتے رہے بلکہ ازمنۂ وسطیٰ کے اختتام تک عیسائی مصنفین بھی اس بارے میں یہودیوں کے ہم نوا رہے اور نشاۃِ جدیدہ کے بعد اس غلط خیال کو بڑی مشکل سے ختم کیا گیا[2] اور یہ بتایا گیا کہ ارسٹو بولوس نے جن یونانی اشعار کو اپنے اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا تھا کہ یونانی افکار یہودیوں کی مقدس کتابوں سے ماخوذ ہیں وہ یونانی اشعار خود مجہول تھے[3]۔ لیکن عصرِ حاضر کی تحقیق نے درجِ بالا غلط خیال کے بجائے ایک اور غلط خیال رائج کرنا چاہا۔ یہی یونانی افکار کا یہودیوں کے کتبِ مقدسہ سے ماخوذ ہونا کیا معنی خود یہودیوں کے کتبِ مقدسہ یونانی افکار سے ماخوذ ہیں اور کبھی دبے الفاظ میں یہ کہا گیا کہ اسفارِ خمسہ یعنی عہد نامۂ عتیق کی ابتدائی پانچ کتابوں میں نہیں امثال غزل الغزلات میں بالعموم اور واعظ میں بالخصوص یونانی افکار جلوہ فرما نظر آتے ہیں[4] اور کبھی صاف صاف یہ فرمایا گیا کہ افلاطون کے فلسفہ کا پیپرس تیسری صدی قبل مسیح کے وسط کا لکھا ہوا موجود ہے لیکن عہد نامۂ عتیق کا قدیم ترین ناقص نسخہ بھی جو مانچسٹر کی لائبریری ہے صرف دوسری صدی قبل مسیح کا ہے[5]۔

امثال میں حکمت کے لئے یہ ارشاد ہوا ہے کہ حکمت کو ترک نہ کرنا وہ تیری حفاظت کرے گی اس سے محبت رکھنا وہ تیری نگہبان ہوگی حکمت افضل اصل ہے پس حکمت حاصل کر[6] لیکن اس حکمت سے فلسفۂ یونان مراد لینا اعوجاجِ ذہنی ہے اسی طرح غزل الغزلات میں جو کم از کم محققین کی نظر میں حضرت سلیمان کی تصنیف نہیں ہے[7]۔ یونان کے فلاسفہ کے اثرات کو تلاش کرنا کج فہمی کے مترادف ہے۔ وہاں بے شک واعظ کے درجِ ذیل اقتباسات نگاہِ اول میں پرہو اور اپیکورس ایسے متشککین کے نظریات کے آئینہ دار نظر آتے ہیں:۔

(الف) باطل ہی باطل واعظ کہتا ہے باطل ہی باطل سب کچھ باطل ہے۔ انسان کو اس ساری محنت سے جو وہ دنیا میں کرتا ہے کیا حاصل ہے؟ ایک پشت جاتی ہے اور دوسری پشت آتی ہے پر زمین ہمیشہ قایم رہتی ہے[8]۔

(ب) میرا دل حکمت اور دانش میں بڑا کار داں ہوا لیکن جب میں نے حکمت کے جاننے اور حماقت و جہالت کے سمجھنے پر دل لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ہوا کی چرن ہے کیونکہ بہت حکمت میں بہت غم ہے اور علم میں ترقی دکھ کی فراوانی ہے[8]۔

(ج) پس انسان کے لئے اس سے بہتر کچھ نہیں کہ وہ کھائے اور پئے اور اپنی ساری محنت کے درمیان خوش ہو کر اپنا جی بہلائے[9]۔

لیکن حقیقتاً واعظ جو "شاہ یروشلم داؤد کے بیٹے ہونے کے باوجود حضرت سلیمان نہیں بلکہ کوئی اور بزرگ تھے[10] صرف بے ثباتیِ دنیا ثابت فرمانا چاہتے ہیں اور پرہو کے فلسفۂ تشکیک یا اپیکورس کے فلسفۂ تعیش سے ان کو دور کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔ "زمین ہمیشہ قایم رہتی ہے" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ واعظ فلاسفۂ یونان کی طرح کائنات کو ابدی سمجھتے ہیں بلکہ اس کا صرف یہ مقصد ہے کہ انسانی نسلیں

---

[1] "A History of Philosophy" By Thilly page 147
[2] "مختصر تاریخ فلسفۂ یونان" مصنفہ ڈاکٹر ڈینیس ترجمہ عبد الحکیم صفحہ ۱۰
[3] "A History of Philosophy" By Thilly page 147
[4] The Growth of the Old Testament By Dr. Rowley page 139
[5] "کتابِ مقدس" شائع کردہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور صفحہ ۶۰۵
[6] The Growth of the Old Testament page 148
[7] "کتابِ مقدس" صفحہ ۶۳۲
[8] حوالۂ سابق — [9] حوالۂ سابق صفحہ ۶۳۳
[10] The Growth of the Old Testament page 148

گزرتی چلی جارہی ہیں اور دنیا ابھی فنا نہیں ہوئی ہے۔ اسی طرح "انسان کے لئے اس سے بہتر کچھ نہیں کہ وہ کھائے اور پیئے اور اپنی ساری محنت کے درمیان خوش ہو کر اپنا جی بہلائے۔" کا یہ مقصد نہیں ہے کہ واعظ ابیپکورس کی طرح خدا کو دنیا کے کاموں میں دخیل نہیں سمجھتے تھے اس لئے کہ درج بالا فقرے کے فوراً بعد واعظ کا یہ ارشاد بھی موجود ہے کہ "میں نے دیکھا کہ یہ بھی خدا کے ہاتھ سے ہے"

درج بالا تحریر سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ جب کہ عصر حاضر کے یہودی محققین مثلاً ڈاکٹر ایچ - ایچ راؤلی، پروفیسر عبرانی وکٹوریا یونیورسٹی مانچسٹر، پروفیسر مارس سائمن وغیرہما کے نزدیک براہینِ قاہرہ سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ عہد نامہ عتیق کو غیر محرف ثابت کیا جائے اور نہ یہ مطلب ہے کہ یہودی ثقافت پر یونانی افکار کے مجرد اثر سے انکار کیا جائے بلکہ میرا مدعا ڈاکٹر راؤلی کے الفاظ میں محض یہ دکھانا ہے کہ "چونکہ یونانیوں کے برعکس یہودی مفکر نہیں بلکہ عملی انسان تھے بنا برایں یہود کے افکار میں تصورات مجردہ کا شائبہ نظر نہیں آتا اور جو دینوی حکمت یہودیوں کی کتابوں میں موجود ہے اُس پر بھی مذہبیت غالب ہے"[۵]

یہودیوں کو سب سے پہلے یونانی معاشرت اور ثقافت سے واقف اور متاثر ہونے کا موقع شامی بادشاہ انیٹی اوکیوس چہارم کے عہد میں دوسری صدی قبل مسیح میں ملا - انیٹی اوکیوس چہارم نے اپنی مملکت میں یونانی ثقافت کو رائج کرنے کا عزم بالجزم کر لیا تھا بنا برایں ۱۷۵ء ق - م میں اُس نے یونان کے تتبع میں یروشلم میں ایک ورزش گاہ قایم کی اور یہودی نوجوانوں کو یونانی طرز کی ٹوپیاں پہننے کا حکم دیا - یہودیوں نے بظاہر ان احکام کو خوشی سے قبول کر لیا لیکن ۱۷۰ء ق - م میں جب کہ انیٹی اوکیوس چہارم مصر سے جنگ میں مشغول تھا - یہودیوں نے اُس کے خلاف بغاوت کی مگر یہ بغاوت آسانی سے فرو کر دی گئی اور یروشلم دوبارہ انیٹی اوکیوس کے قبضہ میں آ گیا[۶] اس مرتبہ اُس نے یونانی ثقافت کو رائج کرنے کے ساتھ ساتھ یہودی مذہب کو ختم کرنے کی بھی سعیٔ بلیغ کی اور نہ صرف یہ حکم دیا کہ جو یہودی اپنے لڑکوں کا ختنہ کروائے یا سور کے گوشت سے اجتناب کرے اُسے قتل کیا جائے بلکہ چونکہ زیوس یونانیوں کا قومی دیوتا کا اوتار سمجھا جاتا تھا بنا بریں یہودیوں کے مقدس ہیکل میں زیوس دیوتا کا بُت بھی نصب کروا دیا[۵]

چند برس بعد یہودیوں نے پھر اس وحشیانہ ظلم و تعدی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ۱۶۴ء ق - م میں یروشلم کو انیٹی اوکیوس کے پنجۂ ظلم سے آزاد کروا کر دمتہ الکبریٰ سے صوبہ جاتی خود مختاری کی سند حاصل کر لی اور کم و بیش ڈیڑھ سو برس تک اس صوبہ جاتی آزادی سے متمتع ہوتے رہے -

مشہور رومن شہنشاہ جولیس سیزر کے جانشین مارک انیٹونی نے اپنے ایک یہودی دوست ہیروڈ کو یروشلم کا بادشاہ بنا کر یہودیوں کی صوبہ جاتی خود مختاری کو ختم کر دیا - ہیروڈ نے مقدس ہیکل کی بطرز نو تعمیر کی اور نہ صرف یونانی طرز عمارت کو اختیار کیا بلکہ احکام عشرہ میں سے دوسرے حکم کی خلاف ورزی کر کے مقدس ہیکل کے صدر دروازے پر عقاب کا ایک طلائی مجسمہ بھی نصب کروا دیا - یہودیوں کے اہل ظواہر یعنی فریسی اس بدعت سے سب سے زیادہ ناراض تھے اور جب ہیروڈ مرض الموت میں

۱؎ The Growth of the Old Testament pages 11, 17, 64 etc.
۲؎ Jewish Religious Conflicts pages 21, 22 etc.
۳؎ The Growth of the Old Testament page 137
۴؎ A History of Western Philosophy page 334
۵؎ The Growth of the Old Testament page 158
۶؎ "تو اپنے لئے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا نہ کسی چیز کی صورت نہ بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے" کتاب مقدس ص ۶۸

گرفتار تھا تو انھوں نے اس طلائی عقاب کو ہٹا دیا لیکن اس جرم کی پاداش میں ہیروڈ نے مرتے مرتے کثیر التعداد فریسیوں کو قتل کروا دیا۔ ہیروڈ کا انتقال ۴ سنہ ق۔م میں ہوا اور کچھ ہی زمانہ کے بعد روۃ الکبریٰ نے رومن شہنشاہیت کے تحت صوبہ داری کا طریقہ قائم کر دیا۔

۶۶ سنہ عیسوی میں یہودیوں نے ایک بار اور علم بغاوت بلند کیا مگر رومیوں نے یہودیوں کو شکست دے کر ۷۰ سنہ میں یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ مقدس ہیکل کو پھر شہید کیا گیا۔ یہودیوں کا دوبارہ قتل عام ہوا اور بقیۃ السیف رومن یونانی ثقافت کے سایہ میں زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔[۱]

یروشلم کے یہود کے مقابلہ میں اسکندریہ کے یہود پر یونانی ثقافت کا اثر قدیم تر بھی تھا اور قوی تر بھی۔ اسکندریہ کو سکندر اعظم نے ۳۳۲ سنہ ق۔م میں آباد کیا تھا اور تقریباً اسی زمانے سے یہودی غیر اقوام کی نجاست سے بچنے کے لئے اسکندریہ کے ایک علیٰحدہ حصہ میں آباد ہو گئے تھے مگر یہودیوں کی یہ علیٰحدگی انھیں صرف جسمانی نجاست سے بچا سکی لیکن یونانی ثقافت کے اثرات سے محفوظ نہ رکھ سکی اور رفتہ رفتہ اس یونانی ثقافت کا اتنا اثر پڑا کہ یہودی اپنی مادری زبان یعنی عبرانی کو بھول بیٹھے اور ان کے لئے عبرانی کی مذہبی کتابوں کا سمجھنا بھی دشوار ہو گیا۔ ٹالمی ثانی کے عہد میں انھیں یونان زدہ یہود کی سہولت کے لئے یہودیوں کی مقدس کتابوں کا ترجمہ عبرانی سے یونانی زبان میں کیا گیا۔[۲] ان مقدس کتابوں کے تراجم کے مطالعہ اور یہود سے خلاملا کا اثر ایک طرف یونانی مفکرین پر تو یہ ہوا کہ یادگیریں ٹس۔[۳] نکومیکس اور نیمونئیس ایسے آزاد خیال مفکرین حضرت موسیٰ کو یہودیوں کا افلاطون اور افلاطون کو ایتھنز کا موسیٰ کہنے لگے اور دوسری طرف یونانیوں کے میل جول اور یونانی فلسفہ کا یہودی مفکرین پر یہ اثر پڑا کہ ۱۵۰ سنہ ق۔م کے قریب ارسٹوبولس نامی یہودی مفکر نے اسفارِ خمسہ کی جو شرح تحریر کی اس میں عہد نامۂ عتیق کے ارشادات اور فلاسفۂ یونان کے نظریات میں تطابق پیدا کرنے کی سعی کی۔ رواقیین کی روح کائنات کو خدا نہ سہی خدا کا مظہر تسلیم کیا گیا عہد نامۂ عتیق میں خدا کے جو انسانی صفات درج ہیں انھیں مجاز پر محمول کر کے خدا کو منزہ از جسم و جسمانیت مانا گیا اور خدا کو ایک ایسی ماوراء الکائنات ہستی تسلیم گیا جسے صرف عقل کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔[۴]

لیکن جیسا کہ اوراقِ گزشتہ میں بتایا جا چکا ہے یہودیوں کی مذہبیت ان کے عقلی نظریات پر ہمیشہ حاوی رہی اور شاید یہودی ہی دنیا کی وہ واحد قوم ہیں جنھوں نے ہزاروں برس کی غلامی کے باوجود اصل الاصول یعنی توحید کو کبھی ترک نہیں کیا اور ارسٹوبولس ہو یا فائلو یہودی کسی نے بھی نہ بنی اسرائیل کے خدا کا انکار کیا اور نہ تخلیق کائنات کا۔

دراصل فائلو اور ابن میمون کا شمار متکلمین یا مدرسین میں ہونا چاہئے تھا لیکن چونکہ قابلِ ذکر یہودی متکلمین یا مدرسین و فلاسفہ بہت کم ہیں بنا بریں میں نے تینوں یہودی مفکرین کا ذکر یہودی فلاسفہ کے عنوان کے تحت کرنا مناسب تصور کیا ہے۔[۵]

۱۔ فائلو یہودی

فائلو کو اس کے ہم نام فائلو یونانی سے ممیز کرنے کے لئے کبھی فائلو اسکندروی اور کبھی فائلو یہودی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

فائلو ۲۰ سنہ ق۔م میں پیدا ہوا اور ۵۰ سنہء یا ۵۴ سنہء میں انتقال کیا یعنی وہ حضرت عیسیٰ کا ہمعصر کہا جا سکتا ہے۔

A History of Western Philosophy page 341 [۱]

A History of Philosophy By Thilly page 146 [۲]

History of Philosophy by Weber page 126 [۳]

A History of Philosophy By Thilly page 147 [۴]

A History of Philosophical Systeme pages 66, 133 [۵]

فائلو یہودی نے مذہب کو فلسفہ کے مطابق ثابت کرنے کے لئے عہد نامۂ عتیق کے متعدد تفاسیر سپردِ قلم کئے اور رواقیین کے تتبع میں خدا کے ان صفات کا جو عہد نامۂ عتیق میں درج ہیں اور جن میں تجسیم کا شائبہ پایا جاتا ہے یہ کہکر انکار کیا کہ یہ صرف مجاز ہے۔ فائلو نے مذہب اور فلسفہ کے تطابق کے لئے صرف خدا کے انسانی صفات سے انکار نہیں کیا بلکہ تشبیہ اور استعارے کے پردے میں انبیاءِ بنی اسرائیل کے وجود سے بھی یہ تصور کر کے انکار کیا کہ حضرت آدم سے مراد روح یا دماغ ہے حضرت حوا سے جسمانی احساس اور جناب یعقوب سے رہبانیت[۱] لیکن اس کے باوجود فائلو اصل اصول یعنی توحید میں فلاسفہ سے متفق نہ ہوسکا اور پروفیسر برٹرنڈرسل کے الفاظ میں فائلو فلسفہ میں افلاطون کا متتبع ہونے کے باوجود مذہب میں قدامت پرستی کی طرف مایل رہا۔[۲]

جیسا کہ اس سے قبل تحریر کیا جا چکا ہے فائلو یہودی کے عصر تک کوئی یونانی فلسفی تخلیقِ کائنات کا قایل نہیں تھا اور فائلو یہودی کے بعد بھی فلاطنیس کے استاد امیونیس ساکاس کے علاوہ کوئی اور یونانی فلسفی تخلیقِ کائنات کا قایل نہیں ہوا لیکن ان یونانی فلاسفہ کے برعکس فائلو یہودی کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا زمان و مکان سے قبل موجود تھا اور خدا ہی نے زمان و مکان کو کائنات کے ساتھ خلق فرمایا۔[۳]

خدا کو فائلو ماوراء الکائنات سمجھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ خدا انسان سے اتنا دور ہے کہ انسان نہ خدا کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کی کسی صفت کو۔ انسان بس اتنا سمجھ سکتا ہے کہ خدا ہے لیکن یہ کبھی بھی نہیں سمجھ سکتا کہ خدا ہے کیا؟ خدا ہر شے کا سبب اور منبع ہے اور ہر شے اس میں موجود ہے یا بالفاظ دیگر خدا کی وجہ سے قایم ہے۔ خدا محض قوت ہے محض کمال ہے محض خیر ہے اور محض رحمت ہے اسی طرح خدا خالص دماغ یا خالص عقل یا خالص فکر ہے۔[۵]

اس ماوراء الکائنات خدا کو ناپاک مادی دنیا میں دخیل ہونے سے فائلو نے کبھی تو ملائکہ اور شیاطین کے وجود کو تسلیم کر کے روکا ہے اور کبھی یونانی فلاسفہ کے تتبع میں روحِ کائنات یا تصوراتِ مجردہ کے وجود کو مان کر اسی طرح کبھی خدا کے صفات سے تعبیر کیا ہے، کبھی خدا کے خیالات سے کبھی عقلِ کائنات سے اور کبھی عقلِ الٰہی سے۔[۶]

ان وسائط کو فائلو نے علی الاکثر لوگوس کے فلسفیانہ نام سے بھی یاد کیا ہے۔[۷] یونانی فلاسفہ میں سب سے پہلے ہیراقلیطس نے لوگوس کے لفظ کو استعمال کیا تھا۔ ہیراقلیطس کا فلسفیانہ نظریہ تغیر کا نظریہ تھا یعنی کائنات کی ہر شے ہر لحظہ تغیر پذیر ہے اور اگر ہم صرف حواسِ خمسہ کی مدد سے کسی چیز کو سمجھنا چاہیں تو یہ محال ہوگا لیکن خوش قسمتی سے حواسِ خمسہ کے علاوہ ہمیں لوگوس بھی عطا فرمایا گیا ہے اور اسی لوگوس یعنی عقل کی مدد سے ہم ہر لحظہ بدلتی ہوئی اشیاء کے متعلق کوئی صحیح رائے قایم کر سکتے ہیں اور اس تغیر پذیر کائنات میں اگر کسی شے کو قیام ہے تو اسی لوگوس کو جو الٰہی قانون ہے لیکن عقلِ الٰہی اپنے کمال میں انتہائی انسانی عقل سے اتنی ہی بلند ہے جتنا انسان ایک بندر سے۔[۸]

۱؎ A History of Philosophy By Thilly page 147

۲؎ A History of Western Philosophy page 342

۳؎ Plotinus By Prof. Armstrong page 23

۴؎ A History of Philosophy By Thelly page 148

۵؎ Ibid

۶؎ حوالۂ سابق

۷؎ A History of Philosophical Systems page 133

۸؎ History of Philosophy By Weber page 20

ہیر اقلیطس کی طرح زینو رواقی اور اُس کے متبعین بھی اصل کائنات آگ کو مانتے تھے اور اسی آگ کو جو کائنات میں اس طرح جاری و ساری ہے جیسے شہد کے چھتے میں شہد رواقیین کبھی خدا کے نام سے یاد کرتے تھے کبھی زیوس دیوتا کے نام سے اور کبھی لوگوس کے نام سے[1]۔

فائلو یہودی نے لوگوس کو خدا تسلیم نہیں کیا بلکہ خدا سے دوسرے درجے پر رکھا۔ اُس نے کبھی لوگوس کو خدا کا پہلا بیٹا کہا کبھی افضل ترین ملائکہ کبھی آسمانی آدم اور کبھی خدا کی شبیہ۔ فائلو کے نزدیک لوگوس قدرتِ مجسّم اور رحمتِ مجسّم ہے۔ اس کے خیال میں لوگوس تمام صور کا منبع ہے اور لوگوس ہی کے ذریعہ سے خدا نے بے کیفیت مادے کو خلق فرمانے کے بعد اس کائنات کی تدوین فرمائی جو در اصل صورِ علمیہ یعنی افلاطون کے عالم مثال کی نقل ہے[2]۔

لیکن یہ لوگوس، فائلو کی نظر میں غایت المراد نہیں تھا۔ اُس کے نزدیک جسم روح کی قبر ہے اور اس قبر سے نجات پانے کے لئے لوگوس کا تصور سود مند نہیں بلکہ خدا کا تصور فایدہ مند ہے نیکی کی انتہا فقط خدا ہے جس کا براہِ راست تصور کرنے سے ہم اس کے قریب پہونچ سکتے ہیں بلکہ لوگوس وغیرہ کے درمیانی مدارج طے کرنے کے بعد[3] اگر خودی کا آفتاب غروب ہوجائے اور اگر خدا کا فضل شامل ہو تو انسان کو اسی دنیا میں نہ صرف خدا کا ادراک ہوجاتا ہے بلکہ لغوی معنوں میں خدا کا دیدار بھی حاصل ہوجاتا ہے[4]۔

فائلو کے نظریات کے مطالعہ کے بعد ایک ہوش مند انسان اس نتیجے پر پہونچنے کے لئے مجبور ہے کہ نصرانیت اور نو افلاطونیت پر فائلو کے تعلیمات کا اثر پڑا لیکن چونکہ ہمارے عصر میں تحقیق کے بغیر یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ نصرانیت یونانی فلسفہ سے متاثر ہوئی اور نو افلاطونیت ایشیائی اور یونانی فلسفہ کے امتزاج سے بنا بریں علی الاکثر فائلو یہودی کے اثر کا مطلق ذکر نہیں کیا جاتا اور اگر کبھی نو افلاطونیت کے سلسلہ میں فائلو یہودی کا ذکر کیا بھی جاتا ہے تو کبھی یہ فرما کر شک پیدا کیا جاتا ہے:۔ ”خُدا سے دور ہونے کا روح فرسا خیال انسان کی روح کو احد اور ماورائے وحدت کے وصل کا مشتاق بنا دیتا ہے اور روح کا یہ صعود ہی وہ وصل بالحق ہے جس میں شاہد و مشہود میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا اور اسی وصل کی کیفیت کو فائلو اور فلاطینس نے بیان کیا ہے جو شاید فائلو کے نظریات سے واقف تھا[5]“ اور کبھی یہ کہکر ”بعض اوقات فائلو یہودی لوگوس کو نورِ الٰہی کا پرتو بھی کہتا ہے اور یہ نظریہ ایک حد تک فلاطینس کے نظریہ کا پیش خیمہ کہا جاسکتا ہے[6]“

بے شک پروفیسر الفرڈ ویبر نے نصرانیت کے متعلق کمال فراخ دلی سے یہ اعتراف فرمایا ہے کہ فائلو یہودی کا لوگوس کا نظریہ یعنی لوگوس کا کلمہ۔ عقل۔ خُدا کا بیٹا اور دوسرا خدا سمجھنا یوحنا کی انجیل میں داخل کرلیا گیا[7]۔ (باقی)

---

[1] A History of Western Philosophy page 279

[2] A History of Philosophy By Thilly page 148

[3] ”مختصر تاریخ فلسفۂ یونان“ مولفہ ڈاکٹر ولیہلم نیسل صفحہ ۱۷۰۔

[4] Thilly - A History of Philosophy page 149

[5] A History of Philosophical Systems page 134

[6] A History of Philosophy By Thilly page 148

[7] History of Philosophy page 125 Foot Note.

توقیت تاریخ اسلامی ہند کے سلسلہ میں اڈیٹر نگار نے توقیت مرتب کی تھی جس میں سنہ ۱۵ھ سے ۹۳۲ھ تک کے تمام اہم تاریخی واقعات بتعیین سنہ ہجری یکجا کردئے گئے ہیں۔ تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی کارآمد چیز ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ علاوہ محصول۔ منیجر نگار لکھنؤ

ذوق کی تصانیف

(محمد انصار اللہ نظر گورجوی)

شیخ محمد ابراہیم ذوق کے متعلق مولانا محمد آزاد کے مختلف بیانات سے معلوم ہوتا ہے گویا وہ ہمہ وقت شعر و سخن اور کتب بینی میں مصروف رہتے تھے، مثلاً مولانا آزاد کے یہ فقرات دیکھئے:۔

"حقہ منہ سے لگا رہتا تھا، کھرّی چار پائی پر بیٹھے رہتے تھے لکھے جاتے یا کتاب دیکھے جاتے تھے۔" (آب حیات صفحہ ۵۸۱)

ذوق کے اس قدر شوق کتب بینی کے پیش نظر یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کی تمام عمر کی تصنیف یہی ایک مختصر سا دیوان نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ ذوق کے اس مختصر دیوان کے متعلق مولانا آزاد کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ "تصنیف کے دریا میں سے پیاس بھر پانی بھی نہیں" ان کے قصاید کو دیکھئے دیوان مروجہ میں "آتش و آب و خاک و باد" کی ردیف میں کل دو شعر لکھے ہیں ؎

صرصر و کوہ میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد — آج نہ چل سکیں گے پر آتش و آب خاک و باد
تاکہ یہ گبر اور ہنود طاق پرست پون باز — چھوڑ دیں شرک پوجنا آتش و آب و خاک و باد

دونوں اشعار کا قافیہ مختلف ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ دونوں دو مختلف کاوشات کی یادگار ہیں، دو ہی نہیں بلکہ مولانا آزاد کا بیان ہے کہ ذوق نے اس ردیف میں ایک غزل اور تین قصیدہ کہے تھے (آب حیات صفحہ ۵۲۷)۔ یہ کاوشات ذوق کے شباب کی تھیں اور شاہ نصیر جیسے مسلم الثبوت استاد سے معرکوں کی یادگار تھیں آج ہوتیں تو ہمیں ذوق کی قدرت کلام کا اندازہ ہوتا کہ عناصر اربعہ کو کس کس طرح باندھا ہوگا۔

ایک قصیدہ "ہفدہ زبان" ذوق نے عالم شباب میں تکمیل علوم کے بعد تصنیف کیا اس پر دہلی کے دربار سے انکو خاقانی ہند کا خطاب عطا ہوا مولانا آزاد کہتے کہ "اس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع بدائع صرف کئے تھے اس کے علاوہ ایک ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا ان کی تعداد اٹھارہ تھی" (آب حیات صفحہ ۵۲۹)۔ اگر حساب کیا جائے تو اس قصیدہ کے کل اشعار کی تعداد تین سو سے بھی زائد تھی ان میں سے اب صرف تین شعر بطور تبرک باقی ہیں مگر ہر شعر سے علمیت اور کمال فن کا اظہار ہوتا ہے، ملاحظہ ہوں ؎

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھیرا مسکن — آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن
جوش روئیدگیٔ سبزہ پہ یاد آئی ہے — آیۃ انبتہ اللہ نباتاً حسنا
جس طرح شعلہ کا عالم ہو بہ فانوس خیال — خوف سے یوں لرزاں ہے عدو زیر کفن

"تیلیاں" کی ردیف میں بھی شاہ نصیر سے معرکے رہے غالباً اسی زمین میں بھی ذوق نے قصیدہ کہا تھا مولانا آزاد کا یہ فقرہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے:۔

"استاد کی سب غزلیں اس زمین میں نہ ملیں۔۔۔ دو مسودے ساتھ آگئے ہیں ایک پر کچھ شعر قصیدہ کے بھی ہیں مگر سب پڑھے نہیں جاتے غزل کے شعر لکھتا ہوں" (دیوان ذوق صفحہ ۱۳۹)

یہی نہیں بلکہ دیوان مروجہ میں ان کے علاوہ پانچ قصاید کے صرف ایک ایک شعر باقی ہیں، گیارہ قصاید کے محض دو دو اور چار چار شعر بطور یادگار زینت دیوان ہیں وغیرہ اس طرح ہمیں کل اکیس قصاید کا پتہ چلتا ہے جو دیوان مروجہ کے تقریباً مکمل پچیس قصاید کے

علاوہ ہیں، ظاہر ہے کہ بہت سے ایسے قصیدے بھی ہوں گے جن کا اب کوئی نشان نہیں ملتا اگر یہ سب جمع ہو جاتے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بقول مولانا آزاد خاقانی ہند کے قصاید خاقانی شروانی سے دوچند ہوتے۔

غزلوں کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے دیوان مروجہ میں دو سو بائیس مکمل غزلیں لکھی ہیں، اڑسٹھ غزلیں "ناتمام درج ہیں اور تقریباً ایک سو چالیس مطلعے شامل ہیں، مختلف قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر مطلع مکمل غزلوں کے باقی ماندہ اشعار ہیں، ان کے علاوہ متعدد غزلوں اور مطلعوں کا علم قدیم تذکروں وغیرہ سے بھی ہوتا ہے جو موجودہ دیوان کی زینت نہ بن سکے ان میں سے بعض کی نشاندہی میں نے اپنے مضمون "دیوان ذوق مرتبۂ آزاد پر ایک نظر" میں کی ہے جو ماہنامہ "نگار" کی ماہ مارچ ۵۸ء کی اشاعت میں شریک ہو چکا ہے۔

قطعات اور رُباعیات کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب اپنے ایک خط میں چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں:-

"اکتوبر ۱۸۳۷ء کے دو چار مہینے کے آگے کے اوراق دیکھے جائیں جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوق کے دو سکے ان کے نام کے کہکر نذر گزرانے کا ذکر مندرج ہو۔ بے تکلف وہ اخبار چھاپہ کا اصل بہ جنسہ میرے پاس بھیج دیجئے" (عود ہندی صـ۲۴)

ذوق کے یہ دونوں سکے بھی دیوان مروجہ میں شامل نہیں ہو سکے اور اب یہ بھی نایاب ہیں۔ ان کے علاوہ مخمس، مسدس، مثلث، مراثی، اور مثنوی وغیرہ وغیرہ سب ہی کچھ ذوق نے کہا مگر یہ سب غدر کی نذر ہو گئیں۔

مولانا آزاد نے مختلف مواقع پر اس امر کا بھی اشارہ کیا ہے کہ ذوق نے ہزار ہا گیت، ٹپے، ٹھمری، ہولی اور سیٹھنیاں وغیرہ وغیرہ بھی کہیں مگر ان میں سے آج نام کو بھی کوئی موجود نہیں، ان حالات میں ہم مولانا محمد حسین آزاد کے قول کی صداقت سے اگر انکار کرتے ہیں تو ایک حد تک مجبور بھی ہیں اور چنانچہ قابل معافی بھی۔ لیکن یہ حقیقت یہ ہے کہ ذوق نے ہندی شاعری کی ان اصناف میں بھی استادی کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ دولت رام شفق، گلفروش وغیرہ ذوق کے وہ تلامذہ ہیں جو اُردو و فارسی ہی اچھی علمیت نہ رکھنے کے سبب غزلیں اور قصاید نہیں کہہ سکتے تھے مگر ان کو فطرتاً موزوں بلکہ شاعرانہ طبیعت ملی تھی چنانچہ یہ لوگ اپنی مادری زبان ہندی میں ہی ہولی، ٹپے وغیرہ لکھ لیتے تھے اور استاد ذوق سے اصلاح لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اصلاح دینے کا سلیقہ ذوق کو کافی مشق و اکتساب کے بعد ہی حاصل ہوا ہوگا۔

شیخ ذوق نے بے شمار تاریخیں اور مختلف لوگوں کے نام کے سجع نہایت لاجواب کہے تھے۔ ان میں سے محض چند کا ذکر آبحیات اور دیوان ذوق میں ہے بہت سے قطعات تاریخ کا ذکر ہم کو مختلف کتب میں ملتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر تلاش کی جائے تو اب بھی کافی مواد اس سلسلہ میں فراہم کیا جا سکتا ہے مگر یہ کام بڑی محنت و کاوش کا ہے۔

ذوق نے خود اپنا دیوان مرتب کرنے کی طرف کما حقہ توجہ نہ کی البتہ مولانا آزاد کا بیان ہے کہ استاد نے اپنا دیوان پہلی مرتبہ ۱۶ - ۱۷ برس کی عمر میں مرتب کیا تھا جو ضائع ہو گیا، ظاہر ہے کہ اگر یہ ہوتا تو اس سے ذوق کے صرف ابتدائی کلام کا اندازہ ہو سکتا تھا جو ان کے شعور سخن کے ارتقا کی دریافت میں مدد دیتا۔ اس کے بعد غالباً شباب میں مولانا آزاد کے والد نے ذوق کو اس طرف توجہ دلائی اور یہ بھی طے ہوا کہ ہر ردیف میں کچھ غزلیں ہونی چاہئیں، چنانچہ ردیف دال کے لئے یہ مصرع طرح ہوا:۔

پنبہ داغ دل پہ اندک سرخ ہے اندک سفید

مگر یہ تجویز بھی عملی صورت نہ اختیار کر سکی۔

عام طور پر ذوق کو ہم صرف شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں اور ان کے اسی مختصر سے دیوان کی بدولت ان کا نام باقی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذوق کو شعر کہنے کے علاوہ شعرائے قدیم کے حالات معلوم کرنے کا بھی بہت شوق تھا چنانچہ انھوں نے متعدد شعرائے اردو کا ایک تذکرہ بھی ترتیب دیا تھا اب اس تذکرہ کا ذکر بھی ہمارے کانوں کو عجیب معلوم ہوتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر یہ

یہ تذکرہ موجود ہوتا تو اس سے نہ صرف شعرائے قدیم کے متعلق بہت سی نئی معلومات ملتیں بلکہ اس سے ذوق کے طرزِ انشاء کا بھی علم ہوتا اور کیا عجب تھا اگر ذوق کے اس تذکرہ کا ذکر مشہور فرانسیسی مستشرق موسیو گارسان دتاسی نے اپنے پانچویں خطبہ مورخہ ۴ر دسمبر ۱۸۵۴ء میں کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ:-

> "تذکرۂ ذوق (شیخ محمد ابراہیم) دہلوی - جو بادشاہ دہلی کے استاد تھے اور عمدۃ الاساتذین اور ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز تھے - مرحوم بوٹروس کے پاس اس کا نسخہ دہلی میں تھا وہ ضرور بڑی خوبی سے لکھا گیا ہوگا کیونکہ تذکرہ نویسوں نے ذوق کی بڑی تعریف کی ہے اور اسے زندہ شعراء میں بہت نامور خیال کرتے ہیں۔"

آبِ حیات کے مطالعہ سے بھی شیخ ذوق کی وسعتِ معلومات کا اندازہ ہوتا ہے - مولانا محمد حسین آزاد نے اس کتاب میں متعدد واقعات استاد ذوق کے حوالہ سے نقل کئے ہیں جو ذوق کی معلومات کے اظہار کے لئے کافی ہیں - ان واقعات سے بھی خیال ہوتا ہے کہ ذوق کا خود تصنیف کیا ہوا تذکرہ کتنا بہتر ہوگا، مگر اب اس کا صرف ذکر باقی ہے -

مولانا محمد حسین آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں کہ "شیخ ذوق فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے تین سو دیوان اساتذۂ سلف کے دیکھے اور ان کا خلاصہ کیا" دیوان ذوق میں ساڑھے سات سو دواوین دیکھنے کا ذکر ہے لیکن یہ فرق غالباً کتابت کی غلطی کے سبب واقع ہوا ہے بہر حال اگر یہ دواوین اساتذہ کا خلاصہ مذکورۂ بالا تذکرہ سے علاوہ کوئی اور تالیف ہے تو یقیناً یہ بھی قابل قدر ہے - زیادہ امکانات اسی بات کے ہیں کہ یہ ذوق کی دوسری تالیف ہے، خلاصۂ دیوان اور تذکرہ میں بہت فرق ہے اس کو مولانا آزاد بھی سمجھ سکتے تھے، ذوق بھی جانتے تھے اور دتاسی بھی ناواقف نہ تھے -

ذوق نے غالباً مختلف اساتذۂ ادب کے دواوین بھی مرتب کئے تھے، مولانا محمد حسین آزاد، اشرف علی خاں فغاںؔ کے ذکر میں لکھتے ہیں

> "ان (اشرف علی خاں فغاںؔ) کے جس دیوان سے میری آنکھیں روشن ہوئیں میرے استاد ظاہر و باطن شیخ ابراہیم ذوق کے لڑکپن کا لکھا ہوا تھا" (آبِ حیات صفحہ ۱۵۲)

مجھے اس سلسلہ میں اصرار نہیں کہ لکھنے سے "ترتیب دینا" ہی سمجھا جائے کیونکہ اب اس سلسلہ میں باوجود تلاش کے کوئی تائیدی یا تردیدی بیان ملنا دشوار ہے - اس میں شک نہیں کہ فغاںؔ کا دیوان ذوق سے پہلے مرتب ہو چکا تھا، لیکن اس بات کے امکانات ہیں کہ ذوق کو کسی ذریعہ سے فغاںؔ کا کچھ اور کلام دستیاب ہو گیا ہو اور اسے انھوں نے دیوان کی صورت میں ترتیب دے کر لکھ لیا ہو، بہر حال اگر یہ صورت ہے کہ ذوق نے فغاںؔ کا دیوان اپنے طور پر مرتب کیا تھا تو بہت خوب ہے ورنہ بصورت دیگر اس سے ذوق کے شعر و سخن سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ابتدا ہی سے شعراء کے دواوین اپنے ہاتھ سے لکھ کر جمع کرتے جاتے تھے مگر محض ہاتھ کے لکھے ہوئے دیوان کا اس طرح ذکر مولانا آزاد سے متوقع نہیں - واللہ اعلم -

یہ ہیں ذوق کی چند تالیفات - ان کے علاوہ بھی ممکن ہے کہ ذوق نے کچھ لکھا ہو مگر ان کا اب کوئی ذکر بھی نہیں ملتا - دراصل ذوق کو علم و فن سے دلی لگاؤ تھا اور اسی دلچسپی سے وہ ہمہ وقت کتب بینی میں مصروف رہتے تھے چنانچہ اکثر لکھتے رہتے تھے - مگر چونکہ شہرت کی ہوس نہ تھی اس لئے انھوں نے اپنی تصانیف کی اشاعت کی طرف توجہ نہ کی - ذوق نے شعر و ادب کی بے لوث خدمت کی، ورنہ محض پیٹ پالنے کے لئے اُن بھی کئی علوم و فنون تھے جن میں ان کو پوری مہارت تھی -

معراج العاشقین

(اُردو کی اولین تصنیف)

"گوپی چند نارنگ نے اسے بڑے سلیقے سے شایع کیا ہے اور مقدمہ میں مصنف و تصنیف دونوں پر بڑی واضح روشنی ڈالی ہے"۔ (علامہ نیاز فتحپوری)

آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی ۶ سے صرف بارہ آنے میں طلب فرمایئے

ایران میں طبی تعلیم کا نظام

(عہدِ صفویہ میں)

ثر چاندپوری)

دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں ایرانؔ، ہندوستان کے لئے ایک تعلیمی مرکز یا یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا تھا، ارباب دانش ن کی تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کرتے اور ہندوستانؔ آکر اپنی قابلیت اور تجربہ کے مطابق عہدوں پر فایز ہو جایا کرتے تھے یہ زمانہ وہ جب ہندوستان میں سلاطین مغلیہ فرمانروائی کر رہے تھے اور ایرانؔ پر خاندان صفویہ کی حکومت تھی، مآثر رحیمی کے مصنف (عبدالباقی ندی) نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ:-

"ایران مکتب خانہ ہندوستان است و مستعدان کسب حیثیات در انجامی نمایند کہ در ہندوستان در مجلس سامی ایں سپہ سالار بکار بر تند"

سپہ سالار سے عبدالباقی کی مراد عبدالرحیم خان خاناں کی ذات ہے جس کے لئے انھوں نے مآثر رحیمی تصنیف کی تھی لیکن درحقیقت ت ٹھیک نہیں ہے، عبدالرحیم کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں بلکہ ایرانؔ سے جو قابل اور موزوں افراد ہندوستان آتے تھے وہ اکبر دوسرے سلاطین کے درباروں سے بھی وابستہ ہوا کرتے تھے یہ اور بات ہے کہ عبدالرحیم ان کی زیادہ سرپرستی کرتا ہو لیکن اس کی ت بہرحال ایک سپہ سالار کی سی تھی، تاجدار اور فرمانروا کی نہ تھی، اس وقت ہندوستان میں مغلیہ خاندان کے اقبال کا سورج رہا تھا، چڑھتی دھوپ تھی اور دودمانِ مغلیہ کا سب سے زیادہ بیدار مغز اور علم دوست بادشاہ جلال الدین محمد اکبر تختِ حکومت یہ افروز تھا اور شاہی دربار کے علاوہ امراء اور صوبہ داروں کی مجلسوں میں بھی ارباب علم کی نہایت گرم جوشی کے ساتھ پذیرائی تی تھی، کوئی شک نہیں کہ اس سلسلہ میں عہدِ اکبری کے مشہور اور دریا دل امیر عبدالرحیم خانخاناں کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ۔ بادشاہ کے دربار میں تو ہمیشہ پانچ ہزاری اور سات ہزاری منصب کی آغوش کھلی رہتی تھی، اس منصب میں اتنی کشش تھی کہ ن کا ہر صاحب علم اس کی تمنا میں ہندوستان ہی کی طرف رخ کرتا تھا، یہ سلسلہ اس وقت تک قایم رہا جب تک دولت مغلیہ کا حکومت تمام ٹکڑے نہ ہو گیا۔

ہندوستانؔ اور ایرانؔ کے اس علمی تعلق سے ہندوستانؔ کو بہت فایدہ پہونچا، ریاضی اور فلسفہ کے ماہرین کثرت سے یہاں ۔ مشہور شاعروں نے بھی ہندوستان ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا، کیفیت یہ تھی کہ دمشق اور بغدادؔ کی علمی بساط اُلٹ چکی تھی، کے نتیجہ میں ایرانؔ کو مرکزیت حاصل ہو گئی تھی اور وہ علوم و فنون کے ماہرین کا گہوارہ بن گیا تھا، آہستہ آہستہ ہندوستان ی جگہ لیتا رہا، یہاں کی زندگی کے ہر شعبہ میں ایرانؔ کے تمدن اور معاشرت کا اثر پڑ رہا تھا اور مسلسل ارباب علم وہاں سے تھے، ایران کے بہت سے شہروں میں درسگاہیں کھلی ہوئی تھیں جہاں اس وقت کے ممتاز اساتذہ درس دیا کرتے تھے، اسی طرح کے مدارس ٹکسال کی مانند علمی سکے ڈھال رہے تھے جو ہندوستانؔ کے بازار میں پھیل جایا کرتے تھے، قدیم طب کے موجودہ ذخیرہ ں میں سب سے زیادہ حصہ انھیں طبیبوں کا ہے جو ایرانؔ کی طبی درسگاہوں میں پڑھ کر ہندوستانؔ آئے اور یہاں آکر انھوں نے

طبی امداد کے وسایل عام کرنے کے علاوہ پڑھانے کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ اس طرح بھارت میں یونانی طبیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی رہی اور ایک وقت آیا جب خود ہندوستان ہی طب کا مرکز بن گیا اور اسے اتنی اہمیت حاصل ہوگئی کہ وہ نہ صرف ایران بلکہ عرب پر بھی سبقت لے گیا، چنانچہ ایسی مثالیں موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ لوگ عرب میں ابتدائی علوم کی تعلیم حاصل کرکے ہندوستان آتے تھے اور یہاں کے مشاہیر اطباء سے اس فن کو سیکھتے تھے، افسوس ہے کہ ہمارے پاس کوئی شہادت نہیں ہے جس کی بنا پر ہم بتا سکیں کہ اس وقت ایران یا ہندوستان میں طب کی تعلیم اور خاص طور پر تشریح کی تعلیم کا طریقہ کیا تھا یوں تو اس کا ایک اصول پہلے ہی سے مقرر تھا اور تشریح کے لئے مردہ انسانی اجسام کام میں لائے جاتے تھے اور کوئی وجہ نہیں کہ دونوں جگہ اس قدیم نظام تعلیم سے انحراف کیا گیا ہو، لیکن ایسی کوئی کھلی ہوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے کہ وثوق کے ساتھ کہدیا جائے کہ انسانی لاشوں پر تشریح پڑھائی جایا کرتی تھی، اور یہ ہماری معلومات کا ایک ایسا نقص ہے جو گہرے مطالعہ کے بعد بھی رفع نہیں ہوسکا۔

دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں جب ایران سلاطین صفویہ کے زیر نگیں تھا، وہاں طبی تعلیم کے بہت سے مرکز تھے جنھیں دارالسلطنت کے علاوہ تبریز، مشہد مقدس اور گیلان کو خاص اہمیت حاصل تھی، ان شہروں میں نہایت ممتاز اطباء درس دیا کرتے تھے اور ان کے فیض تربیت سے اس فن کے بے شمار ماہر پیدا ہوکر ہندوستان اور دوسرے مقامات میں پھیل جایا کرتے تھے اور یوں طبی امداد کا حلقہ وسیع ہوتا جارہا تھا، ایران میں طبی تعلیم کا طریقہ مختلف تھا، اکثر طبیب تو اپنے مکان ہی پر پڑھایا کرتے تھے اور بعض سرکاری یا نیم سرکاری مدارس میں اس فرض کی انجام دہی میں مشغول رہتے تھے ان کے پڑھانے کا اصول کیا تھا اور شعبۂ نظری کے ساتھ ساتھ وہ کیونکر اس کا عملی حصہ مکمل کراتے تھے؟ ــ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس کا ہمیں کچھ پتہ نہیں، لیکن جو طبیب ایرانی اساتذہ سے تعلیم پاکر نکلے ان میں زیادہ تر ایسی ہستیاں نظر آتی ہیں جن کی علمی اور عملی حیثیت اس فن میں مسلم ہے اور انھیں اپنے فن کے ہر شعبہ پر ماہرانہ عبور تھا، اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ایران کی طبی تعلیم نامکمل نہ تھی، اگر تشریح اور فزیالوجی کی تعلیم انھیں نہ دیجاتی تو ممکن نہ تھا کہ ان کی عملی زندگی اس قدر کامیاب ہوتی، بغداد اور دوسرے اسلامی ممالک میں شفاخانوں اور طبی کالجوں کا نظام بہت مکمل تھا اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ایران میں درس و تدریس کے ان طریقوں کو نمونے کے طور پر سامنے نہ رکھا گیا ہو جو اس سے پہلے طبی دنیا میں رائج رہ چکے تھے، خاص طور پر ایسی صورت میں جب ایرانی اطباء اس امر سے باخبر تھے کہ تشریح اور علم افعال الاعضاء میں مہارت حاصل کئے بغیر طب میں کمال پیدا نہیں کیا جاسکتا، اسی کے ساتھ یہ بات بھی وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ سلاطین صفویہ کو براہ راست طبی درسگاہوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی غالبًا اسی لئے ایران میں سرکاری مدارس کے مقابلہ میں پرائیویٹ اور نجی حیثیت سے مکتبوں کا وجود زیادہ پایا جاتا ہے البتہ بعض مقامات پر ایسی درسگاہیں ضرور تھیں جہاں اطباء کو سرکار سے ان کی خدمات کا معاوضہ ادا کیا جاتا تھا، اردبیل میں شیخ صفی الدین کے مزار سے متعلق اسی نوعیت کی ایک درسگاہ تھی اور حکیم جبرئیل پروفیسر کی حیثیت سے تعینات تھا۔ سلاطین صفویہ شیخ صفی الدین ہی کی اولاد میں تھے اور سلطنت کو اس خاندان میں منتقل کرنے کے سلسلہ میں شیخ موصوف کی توجہ کو زیادہ دخل تھا، اس لئے اردبیل کی درسگاہوں سے قدرتی طور پر انھیں زیادہ لگاؤ رہا ہوگا اور یہ قیاس بیجا نہیں ہے کہ یہاں تعلیم کے وسایل بھی معقول ہوں گے۔ چنانچہ جبرئیل اپنے ہم عصر علماء اور اطباء میں سب سے ممتاز شمار کیا جاتا تھا اور عراق کے ارباب علم کو اس سے بڑی عقیدت تھی یہ مدرسہ شیخ صفی الدین کے مزار کے پہلو میں واقع تھا، ایران میں اس وقت تعلیم کا یہی طریقہ رائج تھا، مزارات کے علاوہ مسجدوں میں بھی تعلیم دی جایا کرتی تھی، اور جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے بعض استاد اپنے اپنے گھروں پر پڑھایا کرتے تھے۔

شاہ طہماسپ ماضی بن شاہ اسمٰعیل صفوی موسوی کے زمانۂ حکومت میں حکیم عمادالدین محمود شیرازی ایران کا نہایت مشہور اور نامور طبیب تھا اسے تصنیف و تالیف اور علاج معالجہ کے ساتھ ہی پڑھانے سے بھی گہری دلچسپی تھی، اس کے اکثر شاگرد فنی مہارت کے اعتبار سے بہت مشہور ہوئے اور بعض ہندوستان بھی آئے، چنانچہ خواجہ خاوند محمود جو ہمایوں کے دور حکومت

میں ہندوستان وارد ہوا تھا حکیم عمادالدین ہی سے نسبت رکھتا تھا، عہد اکبری کا مشہور فلاسفر اور عالم شاہ فتح اللہ شیرازی غیاث الدین محمود کے دامنِ علم سے وابستہ تھا، ہندوستان کے بے شمار اہلِ علم اس سے شاگردی کی نسبت رکھتے ہیں جن میں حکیم علی گیلانی شارح قانون بھی شامل ہے۔ حکیم عمادالدین کی اولاد نے بھی درس و تدریس کے سلسلہ کو جاری رکھا اس کا بیٹا محمد باقر ایران کا استاذ الاطباء سمجھا جاتا ہے اس کے حلقۂ درس سے بہت سے شہرۂ آفاق اطباء فارغ ہو کر نکلے اردبیل کے مدرسہ کا پروفیسر جبرئیل بھی اسی کا شاگرد تھا۔ جس کے درس میں کثرت سے طلباء شریک ہوا کرتے تھے۔

میر غیاث الدین منصور شیرازی بھی اپنے علمی مرتبہ کے لحاظ سے حکیم عمادالدین سے کسی طرح کم نہیں تھا ایران کی گھریلو طبی درسگاہوں کے سلسلہ میں اسی کا نام بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے، ہندوستان میں بھی اسکی روشنی حکیم فتح اللہ شیرازی کے ذریعہ سے پہونچی۔

ایران کا ایک اور طبیب درس و تدریس کے سلسلہ میں خاص شہرت رکھتا ہے، اس کا نام ملا کمال الدین تھا یہ طب کی تعلیم پر بڑی توجہ کرتا تھا اور کلیات قانون نیز دوسری متداول کتابیں پڑھایا کرتا تھا، حکیم ملا احمد جو ٹھٹھے کے قاضی کا فرزند تھا، اسی کا تربیت یافتہ تھا۔

شاہ طہماسپ کے دورِ حکومت میں حکیم فخرالدین کا نام بھی اسی ذیل میں نمایاں ہے یہ عام طور پر مرزا محمد کے نام سے مشہور تھا اس کا نسب حارث بن کلاہ تک پہونچتا ہے جس نے رسول پاک کی بعثت سے پہلے فارس میں طب پڑھی تھی اور وہاں سے لوٹ کر اپنی قوم سے "طبیب العرب" کا خطاب پایا تھا، حارث بن کلاہ نے رسول پاک کی زیارت اور ملازمت کا شرف بھی حاصل کیا تھا اس کا بیٹا نضر بن حارث حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں باپ سے بھی زیادہ مشہور ہوا، ایران کے طبیب فخرالدین کی شاگردی کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے اس کا بیٹا حکیم صدرا جس کو ۱۰۱۱ھ میں جہانگیر نے پانچ صدی منصب اور مسیح الزماں کا خطاب عنایت کیا تھا جہانگیر کے زمانہ کا بہت بڑا طبیب سمجھا گیا ہے، شاہجہاں کے دربار کا سب سے زیادہ حاذق اور ممتاز طبیب داؤد ملقب خاں بھی مرزا محمد ہی کا شاگرد تھا تبریز میں حکیم ابوطالب طب کا درس دینے میں مشہور تھا اس کا معنوی فرزند محمد امین ہندوستان آیا تھا اور عبدالرحیم خانخاناں کی سرکار سے متعلق ہو گیا تھا، گیلان میں حکیم تاج الدین حسین کی مسندِ درس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا یہ سلطان مراد خاں والیٔ مازندران کا طبیب اور مصاحب تھا۔ علم طب میں اپنے ماموں حکیم صدرالشریعت گیلانی سے تلمذ رکھتا تھا اور مازندران کی طوائف الملوکی میں گیلان آ گیا تھا یہیں طب کی تعلیم کا سلسلہ جاری کر دیا تھا، اس کے مشہور شاگردوں میں حکیم محمد حسین فغفور لاہیجانی بہت نمایاں ہے … ہندوستان آ کر عبدالرحیم خانخاناں کی ملازمت میں داخل ہو گیا تھا۔

ہندوستان کے تمدن اور کلچر پر مجلسی زندگی سے لیکر طرزِ تعمیر تک پر ایران کا بہت زیادہ اثر پڑا ہے، اور دونوں ملکوں کے درمیان ہمیشہ ایک گہرا تاریخی تعلق قائم رہا ہے، جو پولیٹکل اور جغرافیائی حیثیت سے کافی اہم تھا، آج بھی یہ رشتہ موجود ہے، یہاں کی قدیم طبی فضا پر ایران کے بہت گہرے نقوش نظر آتے ہیں، جو دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں بہت تیزی اور چابکدستی کے ساتھ مٹائے جا رہے تھے، طب قدیم کے سلسلہ میں، ہندوستانی تاریخ کو یونان یا عرب کا نہیں ایران کا شکرگزار ہونا چاہئے اور اس تاریخی اور علمی رشتہ کی موجودہ سیاسی دوستانہ تعلقات کے گہرا کرنے میں ضرور استعمال کرنا چاہئے[1]

---

[1] اس مقالہ کی ترتیب کے وقت حسب ذیل کتب میرے سامنے پیش نظر تھیں :- (۱) اکبر نامہ فارسی - (۲) مآثر الامراء ہر سہ جلد فارسی -- (۳) منتخب التواریخ از ملا عبدالقادر فارسی - (۴) آئین اکبری فارسی - (۵) طبقات اکبری فارسی - (۶) بادشاہ نامہ فارسی - (۷) تاریخ الاسلام اکبر شاہ خاں اردو - (۸) رسائل شبلی اردو - (۹) تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ خاں اردو - (۱۰) مسودۂ اطبائے عہد مغلیہ کوثر چاندپوری

ابو العلاء المعری اور رسالۃ الغفران

(احتشام احمد ندوی)

ابو العلاء المعری کی شخصیت دسویں صدی عیسوی کی ایک عظیم شخصیت تھی وہ ایک شاعر، فلسفی، مفکر، انشا پرداز اور ایک صاحب اسلوب انشا پرداز کی حیثیت سے مشہور تھا اس کی عظمت علمی دنیا میں مسلم ہے، عربی ادب کو اس پر ناز ہے۔ قدرت نے اسے بیشمار خوبیوں سے نوازا تھا، وہ بہت ہی ذی استعداد اور ذہین انسان تھا۔ اس کا شمار ان شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے جو صدیوں سے علم و فکر کی دنیا کو متاثر کر رہے ہیں۔ معرّی پہلا عربی شاعر ہے[1] جس نے ادب و شاعری میں فلسفہ کی رنگ آمیزی کی ہے۔ معرّی کے زمانہ تک عربی شاعری کو ذہنی کاوشوں، عقلی کشمکشوں اور نظریاتی اختلافات سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ معرّی نے پہلی بار عربی شاعری کو فلسفہ سے روشناس کرایا اور دقیق فلسفیانہ خیالات اور عمیق نظریات نظم کئے۔ اور عربی شاعری کو علمی خزانوں سے معمور کر دیا۔ معرّی ان خوش نصیب لوگوں میں ہے جن کو نثر و نظم دونوں میں صفِ اول کے ادیبوں اور شاعروں میں جگہ ملی۔ معرّی نے ایک مضطرب اور متجسس طبیعت پائی تھی اُس دور میں زندگی جن راہوں پر جا رہی تھی اس سے ہٹ کر اس نے راہیں تلاش کیں۔ اس نے ادب اور زندگی میں ہم آہنگی بیداری اور اس لحاظ سے بھی اس کا مرتبہ بہت بلند ہے کہ اس نے زندگی کی صحیح ترجمانی عربی شاعری سے کی ہے، عربی نثر میں اس کا مقام بہت بلند ہے، اس نے نثر میں ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے، معرّی کی نثر میں بڑی شگفتگی اور بڑا حسن پایا جاتا ہے اس کا اندازِ بیان بہت ہی موثر ہے وہ الفاظ مشکل اور غریب استعمال کرتا ہے تاکہ اس کے خیالات آسانی سے سمجھے نہ جا سکیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کی ترکیب میں چستی اور زبان میں روانی ہے۔

معرّی کی اکثر کتابیں صلیبی جنگوں کی نذر ہو گئیں۔ موجودہ تصانیف میں اس کی دو کتابیں بہت مشہور اور شہرۂ آفاق ہیں۔ نظم میں لزوم مالایلزم اور نثر میں رسالۃ الغفران۔ دونوں کتابیں اس کی دو مختلف شخصیتوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ لزومیات میں وہ زاہد، فلسفی، زندگی سے بیزار، مختلف عقاید کا حامل اور ایک مایوس انسان نظر آتا ہے، لیکن رسالۃ الغفران میں اس کی شخصیت بہت ہی بذلہ سنج اور دلکش نظر آتی ہے اس میں وہ خود بھی ہنستا ہے اور دوسروں کو بھی ہنساتا ہے۔ وہ سماجی اعتقادات پر طنز کرتا ہے اور بہت ہی مزاحیہ انداز میں۔ اب میں رسالۃ الغفران سے بحث کرتا ہوں۔

رسالۃ الغفران میں بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اس کتاب کو عربی ادب کی عظیم کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے اس کا اسلوب بیان اس دور کی کتابوں سے بالکل جدا ہے، معرّی نے اس میں ایک نیا انداز بیان اختیار کیا ہے اور ذہن و فکر کی اس بلندی پر پہونچ گیا ہے جہاں دُنیا کے دوسرے صاحب فکر برسوں بعد پہونچ پائے ہیں۔ اگرچہ کتاب ایک خیالی اور تصورات کی دنیا پر مبنی ہے لیکن عربی تنقید کا ایک بہترین سرمایہ ہے۔ جاہلی مخضری اور اسلامی شعراء کے اہم واقعات اور ان کے مختلف فیہ اشعار کی بہترین توجیہ معرّی نے رسالۃ الغفران میں پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معرّی کی نظر تاریخ ادب عربی اور شعراء کے دواوین پر کتنی گہری تھی۔ علاوہ ازیں

---

[1] معرّی سے قبل متنبی کے یہاں بھی جگہ جگہ فلسفیانہ اسلوب ملتا ہے، لیکن متنبی کو فلسفہ میں معرّی سے کوئی نسبت نہیں۔

طنز و مزاح کا یہ ایک بہترین ذخیرہ ہے اور معری کا کمال ہے کہ سنجیدہ تنقیدی مسایل کے ساتھ کچھ ایسی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار ہنس پڑتا ہے - اسے پڑھ کر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اس نے یہ کتاب اپنے زمانہ کے لئے نہیں بلکہ موجودہ دور کے لئے لکھی تھی - اطالوی فلسفی ڈانٹے نے بھی بالکل اسی طرح "کامیدیہ الٰہی" Divine Comedia اور ملٹن نے بھی ایک نظم - "فردوس گم گشتہ" Paradise Lost لکھی ہے

ڈانٹے کی وفات ۱۳۲۱ء اور ملٹن کی ۱۶۷۴ء عیسوی ہے لیکن ابوالعلاء کا زمانہ ۹۷۳ء ہے، ان تینوں کا عموماً اور ڈانٹے و معری کا خصوصاً مرکزی خیال بالکل ایک ہے - اس لحاظ سے معری کو ان سب پر سبقت حاصل ہے کیونکہ اس نے اپنی کتاب رسالۃ الغفران ڈانٹے سے ۲۷۲ اور ملٹن سے تقریباً ۵۳۲ سال قبل لکھی تھی - ڈانٹے اور معری دونوں تنقیدی و ادبی وسعت نظر کا ثبوت دیتے ہیں دونوں نے عالم آخرت میں ملاقات کے لئے مشہور معروف لوگوں کا انتخاب کیا ہے - دونوں دوزخ والوں سے علٰحدہ علٰحدہ اور جنتیوں سے اجتماعی طور سے ملتے ہیں - ڈانٹے اور معری کی اہلِ جنت سے گفتگو بالکل یکسانیت رکھتی ہے - دونوں اعراف کا ذکر کرتے ہیں حالانکہ اعرافِ اسلامی عقیدہ کی چیز ہے اس میں بھی مطابقت ہے کہ دونوں نے حضرت آدمؑ سے ملاقات کی ہے - ملٹن کی نظم میں اس سے کم مشابہت پائی جاتی ہے - ملٹن نے فردوس گم گشتہ میں جو ابلیس کی ہیئت اور اس کے حالات بیان کئے ہیں وہ عیسائی روایت کے مطابق نہیں بلکہ اسلامی روایات سے مطابقت رکھتے ہیں - دونوں نے جسمانی عذاب دکھایا ہے، دونوں نے آخرت کے حجابات دور کر کے دینی حقایق کو پیش کیا ہے -

چنانچہ کال گیلانی لکھتے ہیں کہ اگر ہم یہ کہیں کہ ڈانٹے کے پیشِ نظر یہ کتاب رہی ہوگی تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا - کیونکہ صلیبی جنگوں میں فرانسیسیوں اور اطالیوں کا مسلمانوں سے اختلاط ہوا اور وہ عربی کتابیں یورپ لے گئے اور بات مسلمہ ہے کہ فرانسیسیوں سے پہلے اطالویوں نے مسلمانوں سے خوشہ چینی کی تھی جبکہ انھوں نے مسلم طرز کے مدرسہ ملک میں کھولے تھے اور اس میں مترجم عربی کتابیں بھی داخل کی تھیں -

حکیم معری کے ایک معاصر ابن القارح نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں شعراء کے متعلق اظہار رائے کیا تھا اور بہت سے جاہل شعراء کو جہنمی بتایا تھا اور اس میں معری کی تعریف کی تھی - معری نے اس کے جواب میں رسالۃ الغفران لکھا اور اس میں بہت سے جاہل شعراء کو جنتی قرار دیا اور ہر شاعر سے جنت یا جہنم میں ملاقات کی اور جنتی شعراء کو ان کے کسی شعر کی بنا پر ان کی مغفرت ہوئی اور اسی مناسبت سے اس کا نام رسالۃ الغفران رکھا ہے اس کتاب کے دو حصے ہیں ایک میں ان شعراء کا ذکر ہے اور دوسرے میں براہ راست ابن القارح کے رسالہ کا جواب ہے -

پہلے معری ذکر کرتا ہے کہ ابن القارح کا رسالہ مل گیا اور پھر جواب دینے کے بجائے وہ تصور کرتا ہے کہ یہیں وہ جنت دیکھ رہا ہے اس میں عمدہ قسم کی نہریں جاری ہیں، یاقوت و زبرجد کے جام رکھے ہوئے ہیں، طلائی مچھلیاں اس تیر رہی ہیں اور ابن القارح وہاں موجود ہے، جنت کے ایک بہترین قصر میں ابن القارح کے علاوہ سیبویہ کسائی اور دوسرے ادبی لوگ بیٹھے ہوئے ہیں فرشتے ہر دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور سلام کرتے ہیں، عربی نقاد اصمعی بعض اشعار سناتا ہے - ابوعبیدہ کچھ جنگوں کا ذکر کرتا ہے اتنے میں ایک صاحب اٹھتے ہیں اور ایک یاقوت کا بنا ہوا ریکارڈ نہریں ڈال دیتے ہیں اور اس سے بہترین نغمے جاری ہو جاتے ہیں اتنے میں ابن القارح کا جی چاہتا ہے کہ جس طرح وہ دنیا میں سیر و سیاحت کرتا تھا اسی طرح وہاں بھی کرے - چنانچہ جنت کے اصطبل سے وہ ایک یاقوت و مرجان کا گھوڑا لیتا ہے اور اعشیٰ کے کچھ شعر گنگناتا ہوا نکل جاتا ہے، راستے میں ایک آدمی اسے روک کر پوچھتا ہے کہ یہ شعر کس کے ہیں - ابن القارح جواب دیتا ہے کہ اعشیٰ کے! وہ کہتا ہے کہ حضرت میں ہی اعشیٰ شاعر ہوں، خدا نے مجھ پر رحم فرمایا، حالانکہ میں جہنم میں ڈال دیا گیا تھا - زبانیہ نے مجھے سقر میں قید کر رکھا تھا، لیکن قیامت کے میدان

میں، میں نے دیکھا کہ ایک چہرہ سب سے زیادہ روشن ہے اور لوگ ہر جانب سے اس کو پکار رہے ہیں، میں نے زبانیہ کے ہاتھ میں بندھے ہوئے پکارا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میری بھی شفاعت فرمائیے۔ میں مسلمان تھا اور آپ کی بڑی عزت کرتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ علی ذرا اس کو سنبھالنا۔ حضرت تشریف لائے اور دور ہی سے زبانیہ کو ڈانٹا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ میں نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے زبانیہ کو ایک جھٹکا دیا اور قید و بند سے آزاد ہوگیا، حضرت علی حضور کی خدمت میں لے گئے، میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں نے آپ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا آپ نے فرمایا کہ تو دُنیا میں کیوں نہیں آیا، میں نے کہا میری شراب خوری اور قریش نے مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے باز رکھا۔ مجھے اس شرط پر جنت میں داخل کیا گیا کہ یہاں مجھے شراب نہ ملے گی اور یہ قاعدہ بنا دیا گیا کہ جس نے بھی دُنیا میں شراب پی ہے اس کو آخرت میں شراب سے محروم رکھا جائے گا۔ پھر مختلف شعراء کے قصور عالیہ سے گزرتا ہوا ابن القارح ابوذوئب دولی کے یہاں پہونچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ اونٹ کا دودھ دُہ رہے ہیں ان سے ایک شعر کا مطلب دریافت کرتا ہے اور ایک جاہل شاعر ابو آمامہ سے ملاقات کرتا ہے اس سے پوچھتا ہے کہ تمھاری مغفرت کیونکر ہوئی؟ وہ بتاتا ہے کہ میں نے مکہ کی شان میں کچھ شعر کہے تھے اس لئے بخش دیا گیا، اگر بعد تک زندہ رہتا تو اسلام ضرور لاتا۔ جتنے شعراء ملتے ہیں وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ابن القارح کے ساتھ ہو جائیں۔ اس دوران میں جنت میں کچھ چڑیاں دکھائی پڑتی ہیں اور انسانوں کی طرح گفتگو کرتی ہیں، ابن القارح اشارہ کرتا ہے اور وہ سب نوجوان لڑکیاں بن کر گانے لگتی ہیں۔ یہ مجلس غنا و سرود جاری رہتی ہے کہ ایک نوجوان ادھر سے گزرتا ہے، ابن القارح دریافت کرتا ہے "یہ کون ہے؟" معلوم ہوتا ہے کہ یہ لبید بن ربیعہ ہے۔ دریافت کرنے پر وہ اپنی وجہ مغفرت اس شعر کو بتاتا ہے کہ

الا کُل شیئٍ ماخلا اللہ باطل وکُل نعیم لا محالۃ زائل

یعنی خدا کے سوا ہر چیز باطل ہے اور ہر نعمت زایل ہونے والی ہے۔

اس شعر و شاعری کے بعد سب اپنے اپنے ٹھکانے پر پہونچ جاتے ہیں اور اس دوران میں لاکھوں برس گزر جاتے ہیں۔ اب ابن القارح تمیم کے یہاں پہونچتا ہے، تمیم سے کچھ شعر و ادب کے بارے میں سوال کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں شعر و شاعری سب بھول چکا ہوں، ایسا سخت حساب ہوا کہ مجھے اپنی بھی خبر نہیں رہی۔ بڑے بڑے بادشاہوں اور خزانے والوں کو میں نے اپنی آنکھوں سے زنجیروں میں بندھے ہوئے اور آگ کے شعلوں پر عذاب ہوتے ہوئے دیکھا ہے اتنے میں ادبر سے ندائے غیب آتی ہے کہ اس کی فکر تو دُنیا میں کرنی چاہئے تھی!

اس کے بعد معرّی، ابن القارح کی زبان سے اس کی مغفرت کا قصہ بیان کرتا ہے کہ جب وہ قبر سے اُٹھا تو پانچ ہزار سال راستہ میں صرف ہو گئے۔ پھر قیامت سے جنت کے دروازہ تک بہت وقت لگ گیا۔ وہاں جنت میں داخلہ ہی نہیں ہو رہا تھا، رضوان نے صاف انکار کر دیا لیکن ابن القارح کو یقین تھا کہ وہ جنت میں ضرور جائے گا کیونکہ اس کے پاس توبہ کا سرٹیفکیٹ تھا۔ اس نے سوچتے سوچتے ایک تدبیر سوچی کہ اگر رضوان کو دھوکا دیا جائے تو داخلہ ہو سکتا ہے چنانچہ اس نے بہت سے عمدہ قصیدے رضوان کی شان میں لکھے اور اس کے سامنے بہت مودب ہو کر پڑھا لیکن رضوان کچھ سمجھا ہی نہیں۔ جب وہ کئی قصیدے سنا چکا اور کچھ شنوائی نہ ہوئی تو دریافت کیا کہ آپ قصیدوں کی پروا بھی نہیں کرتے حالانکہ اس سے دُنیا میں بادشاہوں تک کے دل رام ہو جایا کرتے تھے۔ اس نے کہا قصیدہ کیا بلا ہے؟ ابن القارح نے جواب دیا کہ شعر ہوتے ہیں۔ اس نے کہا شعر کیا چیز ہے۔ ابن القارح نے کہا یہ موزوں مقفیٰ کلام کو کہتے ہیں اس کی جمع اشعار آتی ہے، اس نے کہا فضول مت بکو ورنہ یہاں سے بھی بھگا دئے جاؤ گے۔ تو وہ ایک دوسرے داروغہ "زُفر" کے پاس ایک بہت طویل قصیدہ لے کر پہونچا لیکن وہ بھی منہ دیکھتا رہا اور کچھ نہ سمجھ سکا البتہ اس نے یہ بتایا کہ تم شفاعت تلاش کرو تو کام چلے گا۔ اتفاق سے حضرت حمزہ مل گئے ان کے توسل سے ابن القارح حضرت علی کے پاس جا رہا تھا کہ راستہ میں اس نے دیکھا کہ کچھ دیہاتی علی فارسی کو پریشان کر رہے ہیں اور ان سے برسرِ پیکار ہیں۔ وہ جلدی سے وہاں پہونچا اور دو چار دیہاتیوں کو پیٹ پڑھ

فارسی کو ان سے نجات دلائی اور پھر حضرت علی سے ملنے چل دیا، اس مخاصمت میں وہ سرٹیفکٹ کھو گیا جس میں اس کے توبہ کی ق کی گئی تھی۔ حضرت علی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے توبہ نامہ مانگا لیکن وہ تو کھو چکا تھا لہذا ان سے کچھ کام نہ چلا۔ اب وہ ہاشم کے ایک لڑکے کے پاس گیا اور کہا کہ میں نے جتنی تصانیف کی ہیں ان میں ابتدا و انتہا حضور کے نام سے کی ہے لہذا آپ میرا ایک کردیں! اس نے پوچھا کیا، ابن قارح نے کہا جب حضرت فاطمہ زہرا جنت سے اپنے والد کی زیارت کے لئے گزریں اور پکار ہو جائے ک اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ تو اس وقت مجھے جنت ہی میں رہنے دو۔ جب حضرت فاطمہ اپنے لڑکوں کے پاس سے گزریں تو انھوں نے معاملہ ان کے سامنے پیش کیا، حضرت فاطمہ نے اشارہ فرمایا کہ میں حضرت ابراہیم ابن رسول اللہ کے رکاب سے چمٹ جاؤں اور کے ساتھ ہی اڑ چلوں اس لئے کہ ازدہام کی وجہ سے ان کے گھوڑے زمین پر نہیں بلکہ فضا میں اڑ کر چلتے تھے۔ سب معاملہ ہو گیا اور یہ سب لوگ حضور سے مل کر واپس آرہے تھے کہ ابن القارح پل صراط پر اٹک گیا، حضرت فاطمہ نے مدد کے لئے لونڈی بھیجی لیکن جب وہ ایک طرف سنبھالتی تو یہ حضرت دوسری جانب گرنے لگتے تب اس نے کہا حضور والا آپ میری پیٹھ پر سوار جائیں، ابن القارح بادل ناخواستہ سوار ہو گیا اور وہ اس کو لیکر برق رفتاری کے ساتھ جنت کے دروازہ پہونچی۔ رضوان پھر وہی توبہ نامہ جو کھو گیا تھا طلب کیا، ابن قارح کو غصہ آگیا اور رضوان سے کافی جھگڑا ہو گیا۔ یہ سب ہو ہی رہا تھا کہ ت ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپڑے اور بیچ براؤ کرایا پھر ایک جھٹکے سے اندر کرلیا حضرت فاطمہ نے فرمایا کہ جاؤ لونڈی نے تم کو ہدیہ کردی۔

بعد ازیں حضرت لبید ایک عظیم مشاعرہ منعقد فرماتے ہیں اور اس کے بعد ایک تنقیدی محفل منعقد ہوتی ہے اور مختلف و تنقیدی مسایل زیر بحث آتے ہیں، حوریں ہر طرف حاضر رہتی ہیں۔ لڑکے جام بکف حاضر رہتے ہیں۔ عرب کے مشہور مغنی یں۔ بزم عرب منعقد ہوتی ہے۔ جب سب اکل و شرب سے فارغ ہوتے ہیں تو اپنے اپنے قصور میں چلے جاتے ہیں اور ابن ح بھی اپنی دو حوروں کے ساتھ اپنے محل میں چلا جاتا ہے۔

ایک دن ابن قارح جہنم کو جھانکتا ہے تو وہاں اسے ابلیس بندھا ہوا نظر آتا ہے اور ایک شخص انتہائی بھدی شکل کا کے ساتھ نظر آتا ہے دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ بشار بن برد ہے جس نے ابلیس کی شان میں قصیدہ لکھا تھا، طرح امیر القیس اخطل اور عنترہ وغیرہ سے ملاقات ہوتی ہے لیکن وہ دوزخ سے گھبرا کر بھاگتا ہے جنت میں جب پلٹتا ہے رت آدم سے ملاقات ہوتی ہے اور پھر حسن بصری کو دیکھتا ہے کہ لیٹے ہوئے ہیں اوپر سے ایک انگور کا خوشہ آتا ہے اور ان کے ں چلا جاتا ہے اس کے بعد معری براہ راست ابن قارح کے رسالہ کا جواب دیتا ہے اور زندیقوں کی تاریخ ان کے اہم رجالی ں کے نظریات بیان کرتا ہے، زندیقوں کے قصے لکھتا ہے، منصور حلاج کا قصہ پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتا ہے، ، الحاد اور آواگون پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کرتا ہے اور اس ضمن میں بے شمار اسلامی اور جاہلی دور کے اشعا رتا ہے۔

معری کی یہ تصنیف بڑی اہم ہے۔ اس کتاب میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں وہ قابل غور ہیں اور ایک حد تک اسلامی کے ساتھ استہزا کی کیفیت لئے ہوئے ہیں۔ وہ کیا معاشی، معاشرتی اور سیاسی عوامل تھے جن سے ابو العلاء متاثر ں کے لئے ہمیں اس دور کی تاریخ اور سیاسی و علمی حالت کا جائزہ لینا پڑے گا اس لئے کہ ادیب، ادبی تخلیقات میں محض ک و دو سے ہی کام نہیں لیتا بلکہ وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول اور زندگی کی ان کیفیات سے متاثر ہوتا ہے جو سوسائٹی ی ہوتی ہیں۔ ابو العلاء چونکہ انتہائی ذہین انسان تھا، وہ ایک حساس اور متجسس طبیعت کا مالک تھا، فلسفہ، تاریخ و ادب میں پوری مہارت رکھتا تھا اور خود اپنے زمانہ کا ایک بارسوخ و معزز انسان تھا۔ اس نے اپنے دور کے سیاسی

حالات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور مختلف جگہوں کا سفر کرکے اور وہاں رہ کر تجربات حاصل کئے تھے۔ شام، طرابلس اور بغداد میں اپنی زندگی کا اچھا خاصہ حصہ بسر کیا تھا اور وہاں سے سماجی، معاشی اور سیاسی حالات کی واقفیت کے ساتھ ساتھ اس نے وہاں کے کتب خانوں کو کھنگالا تھا اور علمی و عملی حالت کا جایزہ بھی لیا تھا۔ اس کے حالات زندگی میں ہمیں تفصیل سے یہ بات ملتی ہے کہ شام جاتے ہوئے وہ ایک دیر میں اُتر گیا تھا اور وہاں اس نے کچھ دن رہبانوں کے ساتھ بسر کئے تھے اور ان سے مختلف مذاہب کے علوم و فنون اور فلسفہ سیکھا تھا۔ معری نے برہمنوں کے فلسفہ کا بھی بغائر مطالعہ کیا تھا اور اس کے ذہن و فکر کے بنانے میں سارے عوامل کارفرما رہے تھے اور انھیں عناصر کی جھلک ہمیں اس کی زندگی میں اور تصنیفات میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔

ہارون کے عہد میں بیت الحکمت کے ذریعہ یونانی و ہندی علوم کی کتابوں کا ترجمہ بڑی فراخدلی اور سرگرمی سے کیا گیا تھا اور رفتہ رفتہ دوسری زبانوں کے علوم و فنون سے عربی زبان مالا مال ہوگئی تھی۔ فارسی سے بکثرت عربی میں کتابیں منتقل کی گئی تھیں، معری طبیعتہً فلسفی و مفکر تھا اس نے اپنی پوری توجہ فلسفہ کے حصول کی جانب مبذول کی یونانیوں، ہندیوں اور عجمیوں کے خیالات و مذاہب سے واقفیت بہم پہونچائی کیونکہ عربی اس وقت دنیا کی بین الاقوامی اور ثقافتی زبان تھی اور عباسی عہد کی ابتداء میں جو علم و فن کی ترقی شروع ہوئی تھی وہ اب درجۂ کمال کو پہونچ چکی تھی، معری کا معاصر خلیفہ قایم تھا لیکن معری نے اس سے پہلے قادر باللہ کا عہد حکومت بھی پایا ہوگا البتہ قایم باللہ سے معری کی ملاقات تاریخی طور پر ثابت ہے۔ یہ عباسیۂ بغداد کا زمانہ تھا، خلافتِ عباسیہ کی چولیں ہل چکی تھیں عباسی جاہ و حشمت محض برائے نام باقی تھا۔ دیلمی، ترکی، فارسی اور سلجوقی عناصر عربیت پر غالب آچکے تھے حکومت درحقیقت ان غیر عربی غلاموں اور امیروں کے ہاتھ میں تھی جو اسلام لانے کے بعد عربوں پر چھاگئے تھے، اسلامی فتوحات میں غلاموں اور لونڈیوں کے بطور مال غنیمت ہاتھ آنے کی وجہ سے ہر عربی خاندان تقریباً عجمی ہوگیا تھا اور اس عجمیت سے خلفاء تک محفوظ نہ تھے۔ علاوہ ازیں چونکہ عباسی خلافت کا قیام بھی درحقیقت عجمیوں اور خراسانیوں کی مدد سے عمل میں آیا تھا اس لئے قدرتی طور پر انھیں بڑا اثر حاصل تھا لیکن جب بادشاہوں میں دم باقی نہ رہا تو یہی عناصر درحقیقت حکمران اور صاحب خلافت بن گئے اور انھوں نے خلیفہ کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔ چنانچہ معری کے معاصر خلیفۂ قایم بامر اللہ کے عہدِ حکومت کی بدحالی و بے اطمینانی کا حال ایک مورخ یوں لکھتا ہے کہ "انتظام کی ابتری اور فوجی قوت کی کمزوری سے ملک میں لوٹ مار شروع ہوگئی، بادیہ نشیں قافلوں پر حملے کرنے لگے، یہاں تک کہ حوالی بغداد میں آکر باشندوں کے اموال اور عورتوں کے کپڑے اور زیورات چھین لئے جاتے تھے۔

بغداد کی حالت اس زمانہ میں نہایت ابتر تھی، رہزنی اور چوری عام تھی جا بجا شورشیں برپا تھیں۔ بساسیری نے جو بہاء الدولہ کے غلاموں میں سے تھا وہاں غلبہ حاصل کرکے شیعیت کا علم کھڑا کیا اور عباسی خطبہ کو اُٹھا کر فاطمی خطبہ جاری کردیا۔"

معری کے دور میں خلافت اسلامی کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا جس کو جہاں موقع ملا اس نے وہیں حکومت قایم کرلی، زیدیہ، فاطمیہ، سلجوقیہ، غزنویہ اور کتنی ہی حکومتیں قایم تھیں۔ خود خلافت پر جیسا کہ ابھی ذکر کر چکا ہوں مختلف غیر عربی عناصر غالب تھے صرف قایم باللہ کے زمانہ میں بنی بویہ میں سے جلال الدین بادشاہ قابض رہا، پھر دوسرا شخص محی الدین آیا اور اس کے بعد ابونصر نے قایم باللہ کو جس طرح چاہا رکھا آخر میں طغرل سلجوقی نے آکر خلیفہ کی حفاظت کی اور خود سلطان بنا۔

معاشرتی حیثیت سے بھی پورا معاشرہ بداخلاقیوں کا شکار تھا، ابھی آپ نے دیکھا کہ لوٹ مار اور دوسری برائیاں کس طرح معاشرے میں جڑ پکڑ گئی تھیں، ترکی، ایرانی اور یونانی تخیلات کے دھارے میں ذہن و فکر اسلامی اقدار سے بہت دور ہو چکے تھے۔ امراء و روٗسا کی تعیش پرستی نے سماج سے وہ ساری اقدار چھین لی تھیں جن پر کسی اچھے معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے

و سائٹی دو طبقوں میں منقسم تھی رؤساء اور غلام اور ان میں سے ہر ایک کی حالت ناگفتہ بہ حد تک ابتر ہو چکی تھی۔

اگرچہ ادب میں عہد عباسی ممتاز ہے اور اس دور میں عربی ادب نے بہت ترقی کی خصوصاً ابتدائی اور درمیانی حصّہ میں، اگر ہم عہد باسی کے بعض شعراء کو دیکھیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں الحاد، دہریت اور بے راہ روی شعرائے عربی کا عام شعار ہو چکا ھا، چنانچہ بشار بن برد، ابونواس اور ایسے دوسرے شعراء ملتے ہیں جنھوں نے شاعری کے بجائے فحش بیانی اور الحاد پرستی اپنا شیوہ نالیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ دور اسلامی علوم کا غیر اسلامی علوم سے تصادم کا دور تھا اور جس طرح سیاست میں عربی، ترکی، فارسی ور سلجوقی عناصر میں اک کشمکش تھی، اسی طرح ان کے اذہان اور علوم میں بھی کشمکش تھی اور اس کشمکش میں لوگوں کا ایک دوسرے سے متاثر نا کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے۔

اس کا اندازہ خود ہمیں معرّی کے اشعار اور اس کی کتاب رسالۃ الغفران سے ہوتا ہے جس میں معرّی نے دہریوں، زندیقیوں، دینوں اور عجیب و غریب عقاید کے حاملوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے اس کو پڑھنے والا سخت متعجب ہوتا ہے کہ یا الٰہی یہ اتنی مقدار ں ملحد و زندیق کہاں سے اُبل پڑے تھے حالانکہ اس عہد کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ت سے لوگ اسلام کے سیاسی غلبہ کی بنا پر اسلام میں داخل ہو گئے تھے، حالانکہ انھیں اپنے پُرانے مذاہب و شعائر حد درجہ محبوب ے اور اس کی مثالیں بے شمار ملتی ہیں یہاں تک کہ زندیقوں کی ٹولیاں تھیں ____________ معاملہ کی نزاکت اں تک پہونچی اور یہ وبا اتنی عام ہوئی کہ زندیقوں اور غیر زندیقوں میں امتیاز بہت دشوار ہو گیا۔ حاسدین اس سے فایدہ اُٹھا کر ے رقیبوں کو بدنام کرنے لگے۔

ان حالات میں جب ہم ابوالعلاء معری کی رسالۃ الغفران کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا اور ہمیں یہ صاف ر آتا ہے کہ ابوالعلاء کس ذہنی کشمکش کی ترجمانی کر رہا ہے، غفران میں مغفرت کی جو کیفیت پیش کی گئی ہے وہ البتہ اسلامی نقطۂ نظر سے ں تنقید ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم ابن رسول اللہ کو ظاہر ہے کہ جنت پر کوئی اختیار نہیں اور نہ وہ دنیاوی بادشاہوں کی مثال بن سکتے ں جس میں شاہزادوں کو محض بیٹے ہونے کی وجہ سے حکومت میں رسوخ حاصل ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ "توبہ نامہ" قسم کی اسلامی عقاید ں کوئی چیز ہمیں نہیں ملتی اور نہ مغفرت کے لئے کسی سرٹیفکٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔ تیسرے یہ کہ انداز تحریر میں استہزاء ہے جس سے معرّی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

غفران میں جہاں تک علمی و ادبی مواد کا سوال ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن اس کے فکری پہلو کا جہاں مسئلہ آتا ہے وہاں سے للاف کی راہیں پیدا ہوتی ہیں۔ الغفران کی زبان مقفّیٰ اور غریب الفاظ سے پُر ہے، ڈاکٹر طٰہٰ حسین صاحب فرماتے ہیں کہ "میں یہ پسند نہیں ک لوگ الغفران کی زبان لکھیں، اس لئے کہ وہ بہت ادق اور بعید الفہم ہے اور معرّی نے اس لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے تاکہ عام لوگ اسکے لات سے واقف نہ ہو سکیں جیسا کہ اکثر نقادانِ فن کا خیال ہے۔

بہر حال جو کچھ بھی ہو اسکے عقاید ضرور قابلِ بحث ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ معرّی انتہائی ملحد اور فاسد العقیدہ تھا اس کی زندگی ور اس کی تصانیف اس پر گواہ ہیں ابن جوزی "تلبیس" میں کہتے ہیں کہ "اسلام کے تین زندیق ہیں ابن راوندی، ابو حیان توحیدی، ر ابوالعلاء معرّی" امام ذہبی کا کہنا ہے کہ "وہ تصانیف میں مشہور اور دہریت میں بدنام تھا اس کی کتاب رسالۃ الغفران ایک جلد ں ہے اور اس میں مزدکیت اور استخفاف ہے، بے راہ روی ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بے دین ہو کر یا ہے گیا اور کوئی مذہب پورے طور پر اختیار نہ کر سکا"

یہ خیال عام ہے اور اس کی تصانیف سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اگر واقعی وہ دہریہ تھا تو جو خیالات ہمیں الغفران میں ملتے ہیں

وہ قابل تعجب نہیں ہیں۔ لیکن اچھا خاصہ گروہ ان لوگوں کا بھی ہے جو نہ صرف ابوالعلاء کو مسلمان ہی سمجھتے ہیں، بلکہ عابدوں اور زاہدوں میں اس کا شمار کرتے ہیں۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ شیخ الاسلام الہکاری نے معری سے ملاقات کی جب باہر نکلے تو لوگوں نے پوچھا کہ حکیم معری کے عقاید کیسے ہیں انھوں نے فرمایا کہ وہ مسلمان ہیں۔ امام ذہبی ہی دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ معری آخر عمر میں تائب ہوگیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ کسی فیصلہ پر نہ پہونچ سکا۔

جب ہم اس کی ذاتی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تب بھی ہم کسی قطعی نتیجہ پر نہیں پہونچتے۔ معری صائم الدہر اور قائم الیل تھا، نماز کی برائی اس نے کہیں نہیں کی ہے، بلکہ لزومیات میں نماز و روزہ کی ترغیب دی ہے اور اس کی تصنیفی زندگی کو چھوڑکر ذاتی طور پر کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جو اس کے کفر و الحاد کو ثابت کرسکے۔ ہاں وہ گوشت نہیں کھاتا تھا، لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اُسے حرام بھی نہیں کہتا تھا بلکہ ترحماً ایسا کرتا تھا وہ مٹی کے برتن اور بوریہ استعمال کرتا تھا فرش پر لیٹتا تھا، اکثر روکھی روٹی کھالیتا تھا، روزے ہمیشہ رکھتا تھا اور نماز بڑی پابندی سے ادا کرتا تھا۔ شادی اور نسل افزائی کو بہت بُرا سمجھتا تھا کیونکہ اس کی بدولت معصوم انسان یہاں طرح طرح کے مصائب میں مبتلا ہوجاتا ہے، وہ مُردے کو جلانے کے حق میں بھی تھا اور تناسخ کے عقیدے کے لئے لزومیات میں اچھا خاصا مواد ہمیں ہاتھ آتا ہے لیکن ان سب کے برعکس خیالات بھی ہمیں لزومیات ہی میں ملتے ہیں۔

ان سارے واقعات اور حالات کی روشنی میں جب ہم ابوالعلاء اور اس کی کتاب رسالۃ الغفران پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر تو یقیناً مسلمان تھا، البتہ کون انسان ہے جس کے دل میں شبہات اور وساوس پیدا نہیں ہوتے۔ معری ایک فلسفی تھا اور اپنے دور کے سارے نظریات و خیالات سے واقف تھا، وہ اپنے دل کی واردات آزادی سے نظم و نثر کے قالب میں ڈھال دیتا تھا۔

ابوالعلاء معری کی رسالۃ الغفران اس حیثیت سے بہت قابل قدر کتاب ہے اور اس نے اپنے دور کے بہت پہلے کی چیز محض اپنے غور و فکر اور ذہنی بیداری کی بنا پر پیش کی ہے جس کی نظیر شاید آج کی عربی دُنیا میں مشکل ہی سے مل سکے گی۔

الغفران میں ہمیں اس عہد کی زبوں حالی، بدکرداری اور ذہنی رجحان کی صحیح جھلک نظر آتی ہے۔ توبہ نامہ وغیرہ جو معری کی فکری اور ذہنی پیداوار ہیں، ممکن ہے اس دور کے حالات کی غمازی کرتا ہوں کیونکہ سفارشوں اور بیجا وسیلوں کی وجہ سے حکومت کمزور ہوگئی تھی اور اس طرح معری نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ بہرحال الغفران میں جو دینی، فکری اور شعوری بے راہ روی ہمیں ملتی ہے وہ اس دور کا صحیح مرقع ہے۔

الغفران میں معری کے مطالعہ کے بعد معری کے متعلق جو ایک بیدین انسان ہونے کا تصور پیدا ہوتا ہے اس کے بارے میں بعض اہل الرائے نے بڑی عمدہ تاویل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے صرف معری کو پڑھا ہے اس کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کے دورِ حیات میں بھی اُسے دہریہ ہی سمجھتے تھے، لیکن جن لوگوں نے معری کو قریب سے دیکھا تھا اور اس کے ساتھ رہے تھے انھوں نے بھی اس پر یہ الزام نہیں لگایا۔

خلاصہ یہ کہ اس کی شخصیت اور اس کی آراء اور اس کے نظریات کے باب میں ہمیشہ سے اختلاف رہا ہے اور رہے گا لیکن الغفران کی افادیت ادبیت اور جاذبیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔

ڈاکٹر ذکی مُبارک نے اپنی کتاب "وحی بغداد" میں ابوالعلاء معری کے متعلق ایک عجیب و غریب بات لکھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ معری کو زاہد کہنا بالکل غلط ہے کیونکہ ہر انسان کا کوئی نہ کوئی شوق ہوتا ہے اور وہ اس کے لئے کوشش کرتا ہے، معری کا ذوق علمی تھا اور اسے تصنیف و تالیف اور معنوی زندگی و حصول شہرت کا شوق تھا اور اسی لئے اس نے اپنی پوری زندگی اسی راہ پر قربان کرکے شہرت و معنوی زندگی حاصل کرلی۔ میں سمجھتا ہوں یہ محض ڈاکٹر صاحب کی ذاتی رائے ہونے کے علاوہ یہ رائے اور کسی اہمیت کی حامل نہیں

اگر معری اونچے معیار سے زندگی بسر کرتا امیرانہ طرز و انداز اختیار کرتا تو اس کی علمی شہرت میں کیا کمی واقع ہوجاتی ؟ زہد اختیار کرنے سے اس کی شہرت میں کیا اضافہ ہوا ، اس کی اہمیت و شہرت کا مدار اس کے خانگی معاملات اور ذاتی صفات پر نہیں بلکہ ان علمی کارناموں پر ہے جنھیں اس نے اپنے بعد چھوڑا ہے ۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کا زہد اس کی خشک زندگی ، اس کی عجیب و غریب آراء اور اس کے نظریات سب مختلف فلسفوں کے اثرات تھے .... اور وہ بنیادی طور پر مسلمان تھا البتہ جو وسادس اس کے دل میں آتے تھے انھیں وہ چھپاتا نہیں تھا اپنی نظم و نثر میں بیان کر دیتا تھا اور اسی حیثیت سے اس کی کتاب " الغفران " بھی دیکھنی چاہئے ۔

مکتبہ جدید لاہور کی مشہور تاریخی، سوانحی اور نفسیاتی مطبوعات

جو ظاہری و معنوی دونوں حیثیتوں سے معیاری درجہ رکھتی ہیں ، آپ ہندوستان میں ہمارے ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہیں ۔ ذیل کی فہرست ملاحظہ فرمایئے اور آپ کو جو کتابیں درکار ہوں ان کی قیمت مع محصول ڈاک ذریعہ منی آرڈر ہمارے پاس بھیج دیجئے (کمیشن ، وی پی کا کوئی سوال نہیں) لیکن کوئی آرڈر دس روپے سے کم کا نہ ہونا چاہئے جس کے ساتھ محصول ڈاک بھی بحساب پندرہ فی صدی آپ کو بھیجنا چاہئے ۔

منیجر نگار لکھنؤ

سلسلۂ تاریخ و سوانح

حیات محمد ... (محمد حسین ہیکل) ..... انیس ۱۹ روپے
ابوبکر صدیق ... (" ") ..... دس ۱۰ روپے
الحسین ... (" ") ..... ڈھائی روپے
الزہرا ... (" ") ..... دو ۲ روپے
الہارون ... (" ") ..... پانچ ۵ روپے
خالد سیف اللہ (ابوزید شبلی) ..... پانچ ۵ روپے
عمرو بن العاص (حسن ابراہیم حسن) ... پانچ ۵ روپے
چنگیز خاں ... (ہیرلڈ لیمب) ..... پانچ ۵ روپے
امیر تیمور ... (" ") ..... سات روپے

سلسلۂ نفسیات عملی

جینے کا قرینہ ... (آندرے موروا) .... چھ ۶ روپے
پریشان ہونا چھوڑئے (ڈیل کارنیگی) ... چھ ۶ روپے
میٹھے بول میں جادو ہے (") ... سات روپے
زندگی اور عمل (ڈاکٹر مارڈن) ... دو ۲ روپے
کامیاب زندگی (ہربرٹ کیسن) .. دو ۲ روپیہ آٹھ آنے

جینے کی اہمیت (لین یوتانگ) ...... بارہ ۱۲ روپے
زندگی کا راستہ (ریوس - مٹیس جیبیر) ..... چھ ۶ روپے
کامیابی کا راستہ (" ") ..... چار ۴ روپے
اپنا راستہ خود بناؤ (فالق کامراں) ..... چار ۴ روپے
آداب زندگی (محمد اقبال سلمان) ..... تین ۳ روپے

بعض اور مفید و دلچسپ کتابیں

مقدمہ شعر و شاعری (ڈاکٹر وحید قریشی) ... چھ ۶ روپے
شعرائے اردو کے تذکرے (ڈاکٹر سید عبداللہ) دو ۲ روپے
علم کے نئے افق (سی - ام - جوڈ) ... چار ۴ روپے آٹھ آنے
افکار غالب (ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم) ... آٹھ ۸ روپے آٹھ آنے
فکر اقبال ... (" ") ...... دس ۱۰ روپے
روح اقبال (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) .. سات روپیہ آٹھ آنے
شعر العجم کامل (مولانا شبلی) ...... بارہ ۱۲ روپے
تاریخ الامت ۸ حصے (مولانا اسلم جیراجپوری) پندرہ ۱۵ روپے
ترجمان القرآن (مولانا آزاد) اول و دوم بتیس ۳۲ روپے
شعر الہند کامل (عبدالسلام ندوی) .... اٹھارہ ۱۸ روپے
اردو غزل (یوسف حسین خاں) .... دس ۱۰ روپے

اب سے پچاس سال پہلے

جب آتش جواں تھا

(چند دن حسن آباد بمبئی میں)

(مسلسل)

(نیاز فتحپوری)

ہشب آتشیں روئے گرم ژند خوانیہاست
گزبش نواہردم در شرر فشانیہاست
(غالب)

سنہ ۶

شیریں، اس قسم کی حسین عورتوں میں تھی، جن کے چہرہ سے بہ نسبت حسن ظاہر کے حسن فطرت زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور دیکھنے والا بجائے مسحور ہونے کے مرعوب ہو جاتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ایک عمیق چشمۂ سرمدی تھیں جن میں دلربائی سے زیادہ معصومیت اور رادیت سے زیادہ روحانیت پائی جاتی تھی، اس کی صورت دیکھنے کے بعد ایک شخص ایسا محسوس کرتا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے جب اس سے گفتگو کی جاتی تو وہ اس طرح جواب دیتی جیسے کسی لابید فاصلہ سے کھینچکر اپنے آپ کو واپس لائی ہے اور جواب دے کر پھر وہیں چلا جانا چاہتی ہے۔ ہرچند جب افضال سامنے ہوتا تو اس کا بہترین مشغلہ سوا اس کے کچھ نہ ہوتا کہ وہ اس کی صورت کو دیکھا کرے لیکن اسوقت بھی اس کا انداز کچھ کھویا ہوا سا رہتا اور ایک نامعلوم جستجو اس وقت بھی اس کی چتون سے ظاہر ہوتی اس نے جب اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے نقوش مجھے دکھائے تو میں نے ان کے اندر بھی یہی رنگ غالب پایا اور کوئی ایک نقش بھی اس کا ایسا نظر نہ آیا جس کو میں "خیال بیدار" کہہ سکتا۔ مناظر سے اُسے خاص دلچسپی تھی لیکن وہ بھی اس قسم کی:۔ ساکن سطح آب، سنسان صحرا، خاموش شب ماہ، برف پوش چوٹیاں۔ ذی حیات چیزوں کی تصویریں بنانے سے کم دلچسپی تھی اور کبھی ضرورتاً منظر کے ماحول کے لحاظ سے بناتی بھی تو اس میں ایک حزن کی کیفیت پیدا کر دیتی۔

اس کا ایک نقش جس کو فرانس کی اکاڈیمی نے بہت زیادہ سراہا تھا "داستان خموش" کے عنوان سے پیش کیا گیا تھا:۔ صبح کا وقت تھا طلوع آفتاب سے قبل، رنگ کے لحاظ سے صحیح معنے میں طباشیر صبح، جنگل کی ایک گلاب کی جھاڑی ہیں شاخ سے ٹوٹ کر گلاب کا مرجھایا ہوا پھول زمین پڑا ہے اور بلبل اسی کے پاس مر کر سرد ہو گئی ہے، منظر کے ماحول میں کچھ ایسی کیفیت پیدا کر دی گئی ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ساری کائنات اس حادثہ کے دیکھنے کے لئے جھکی پڑتی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا "کہ آپ کا خیال اس نقش کی طرف کیونکر منتقل ہوا؟" افضال بھی موجود تھا، وہ شیریں کو بہت دق کیا کرتا تھا فوراً بول اُٹھا۔ "جس طرح اور بہت سی غیر حقیقی باتوں کی نمائش کے لئے ضرورتاً خیال کو منتقل ہونا پڑتا ہے"۔ شیریں جو اس کی اس قسم کی باتوں کی عادی تھی مسکرائی اور بولی کہ "یہ آپ نے بالکل صحیح فرمایا کیونکہ اس نقش میں اگر کوئی جھوٹ حصہ ہو سکتا ہے تو صرف بلبل کا جان دیدینا۔ پھول کا مرجھانا تو کوئی عجیب بات نہیں ہے، اور اس حصہ کو خلاف واقعہ دکھانے میں میری مصلحت سوا اس کے اور کیا ہو سکتی تھی کہ مدعیان محبت کے فریب پر پردہ ڈال دوں، ورنہ شاید آپ کو تکلیف ہوتی"۔

شیریں بہت ذہین تھی اور میرے نزدیک خطرناک حد تک ذہین، لیکن خیرت یہ تھی کہ اس کا جمال ایک ایسی معصوم حقیقت تھا کہ وہ اس کی ذہنیت سے پیدا ہونے والے خطرات کو فوراً بھلا دیتا تھا اور انسان پھر بدستور فریب میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

شیریں اور افضال کی شناسائی سب سے پہلے پیرس میں ہوئی اور، اس درجہ شدید و وسیع ہوگئی کہ وہاں سے واپس آنے کے بعد بھی دونوں جدا نہ ہوسکے۔ شیریں بمبئی میں ایک بڑی جائیداد کی تنہا مالک تھی اور سوسائٹی میں نہ صرف اپنی دولت بلکہ اپنی قابلیت و شائستگی کے لحاظ سے بھی خاص عزت رکھتی تھی۔ افضال یوں تو بظاہر صرف سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتا تھا، لیکن حقیقتاً وہ اس پر مالکانہ اقتدار رکھتا تھا اور اس کا علم تقریباً سبھی کو تھا۔

یقیناً افضال ایک خوش رو انسان تھا اور تمام وہ دلربا ادائیں جو ایک حسن مہذب کو مالوف کرنے کے لئے ایک مرد میں ہونی چاہئے اس میں موجود تھیں، لیکن پھر بھی یہ بات ہر شخص نہیں سمجھ سکتا تھا کہ شیریں نے اسی کا انتخاب کیوں کیا۔ جب کہ اسی طرح کے بلکہ اس سے زیادہ یہ ظاہری خصوصیات رکھنے والے انسان اور بہت سے اس کو مل سکتے تھے۔ میرے ایک ہفتہ کے مطالعہ نے مجھے بتایا کہ شیریں افضال سے زیادہ اس کی ذہانت کی دلدادہ تھی اس کے تیکھے پن کی فریفتہ تھی، وہ اس کے جلد برہم ہوجانے کی صلاحیت پر مٹی ہوئی تھی، اور چونکہ وہ خود ایک متامل و خوابیدہ فطرت رکھتی تھی، اس لئے وہ چاہتی تھی کہ کوئی اسے چونکاتا رہے، جگاتا رہے اور افضال جو غالباً اس راز کو سمجھ گیا تھا پیدا ہی ہوا تھا چھیڑ اور شرارت کے لئے۔

شیریں کا معمول تھا کہ وہ ایک بات کا جواب دے کر کچھ سوچنے سی لگ جاتی اور دیر تک اس کی یہی حالت رہتی، لیکن اس وقت افضال کے سوال کا جواب دینے کے بعد بھی وہ آمادۂ گفتگو تھی اور اس کے ساتھ وہ صناعانہ جذبات جو زیادہ تر دماغ ہی کی فضا میں بند رہتے ہیں، آنکھوں کی چمک سے، لبوں کے ارتعاش سے، چہرہ کی سرخی سے، جسم کی ہلکی بے چینی سے ٹپکے پڑتے تھے۔

افضال کو جواب دینے کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہوئی اور بولی کہ ایک نقش دیکھنے کے بعد سب سے زیادہ دلچسپ سوال ایک نقاش کے لئے یہی ہوسکتا ہے کہ اس سے ماخذ نقش، رفتار خیال، انتقال فکر کا سوال کیا جائے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ایک نقاش کے نقوش، اوراقِ حیات ہیں، داستان زندگی ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خطوطِ نقش کے ذریعہ سے وہ دوسروں کا فسانہ بیان کرنا چاہتا ہے اور ایسی صورت میں بعض اوقات دیکھنے والوں کو نقاش کی فطرت کے سمجھنے میں غلطی ہوجاتی ہے۔ آپ نے جس نقش کو پسند کیا ہے وہ مجھے پسند نہیں کیونکہ اس میں بلبل کا وجود میرے ذوق کے منافی ہے، مرجھائے ہوئے پھول کے سامنے اس کا مرجھائے ہوئے پھول کے سامنے اس کا مردہ حالت میں پایا جانا گویا نقاش کے اس خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ نہ عشق حسن کی مواصلت کی تاب لاسکتا ہے اور نہ حسن پایان عشق سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ کائنات کی توجہ گویا اشارہ ہے، اس امر کی طرف کہ ہر چند یہ حادثے نہایت معمولی ہیں لیکن حقیقت کے لحاظ سے کائنات کو ہلا ڈالنے والی ہیں۔ خیال بھی پامال ہے اور تصویر میں اس کا اظہار بھی معمولی بات ہے، میں اگر اکاڈیمی کے بعض ممبروں کے خیال سے آگاہ ہوکر یہ منظر نقش میں پیدا کرنے پر مجبور نہ ہوتی بلکہ آزاد ہوتی، تو میں وہ نقش پیش کرتی جس کو میں نے انتظار کا عنوان دیا ہے، یہ کہہ کر وہ اٹھی اور الماری سے ایک تصویر نکال لائی جس کا یہ منظر تھا:-

> فضا ابر آلود ہے شام کی تاریکی کافی پھیل چکی ہے اور ایک نوجوان لڑکی اپنے جھونپڑے کے دروازے کھڑی ہوئی ہے ابر کے ٹکڑوں اور بجلی کی چمک کو خوف و وحشت کے ساتھ دیکھ رہی ہے، بجلی کی نورانی لکیروں اور بادلوں کے ٹکڑوں سے مل کر اس لڑکی کے منتہائے نظر پر ایک نہایت ہی ہلکی سی مٹی ہوئی صورت اس شخص کی پیدا کی گئی ہے جس کے انتظار میں وہ باہر نکل آئی ہے اور اس کے چہرہ سے گویا خیال ٹپک رہا ہے کہ "کیا اب بھی وہ نہ آئیں گے اور نہ آئے تو یہ طوفانی رات کیونکر بسر ہوگی"۔

اس تصویر کو دیکھ کر میں متحیر رہ گیا۔ شیریں نے اس قدر شدید تاثرات صفحۂ کاغذ میں بھر دئے تھے کہ میری آنکھیں نم آلود ہوگئیں اور میں اس کی طرف سے نگاہ ہٹا کر بالکل خاموش بیٹھ گیا۔ اس نے میری حالت کو سمجھ کر فوراً موضوع گفتگو بدل دیا اور افضال سے مخاطب ہوکر بولی کہ آپ کو یاد نہیں، آج شام کو ماتھران چلنا ہے، مہربانی کر کے سر فضل کریم بھائی کو ٹیلیفون کرکے دریافت کر لیجئے کہ جعفر کمپنی کے مسئلہ میں

کل میری حاضری کی توضرورت نہ ہوگی۔" افضال جو ایسے اوقات میں نہایت ہی مودب سکریٹری کی حیثیت اختیار کرلیتا تھا، اُٹھا اور نہایت ادب سے جھک کر تعمیل حکم کے لئے روانہ ہوگیا۔

افضال کی یہ خصوصیت کہ موقع محل کے لحاظ سے وہ اپنے اوپر متضاد و متباین کیفیات نہایت کامیابی کے ساتھ طاری کرلیا کرتا تھا اس قدر عجیب وغریب تھی کہ میں اس کے اس شعور پر حیران تھا۔ اول دن جب میں نے تنہائی کی ملاقاتوں میں افضال اور شیریں کی گفتگو کو سنا تو حیران رہ گیا کہ شیریں، اس کے لئے کس درجہ سراپا ایثار و سپردگی ہے اور وہ اس کے مقابلہ میں کس قدر شریر و گستاخ، لیکن دوسری صبح جب اس نے ڈرائنگ روم میں شیریں کی ڈاک اور کچھ اور کاغذات پیش کئے تو معلوم ہوتا تھا کہ ملک معظم کے سامنے کوئی اس کا سکریٹری مودب کھڑا ہوا احکام حاصل کر رہا ہے۔

میں نے ایک دن افضال سے اس کے متعلق گفتگو کی تو اُس نے کہا کہ آپ نہیں جانتے آج کل کی مہذب و تعلیم یافتہ عورت کس قدر پیچیدہ معمہ ہے۔ علی الخصوص اس وقت جب دل کا معاملہ اس کے سپرد کیا جائے کہ پھر اس صورت میں تو اس کی نگہداشت ایک ناگن سے زیادہ کرنی پڑتی ہے، شیریں پر جو اقتدار مجھے حاصل ہے، نتیجہ ہے میری چار سال کوشش کا اور بڑی حد تک مجھے اس پر اعتماد ہونا چاہئے لیکن باور کیجئے جس وقت میں اس عورت کو بات کرتے کرتے دفعتہً کسی غور و فکر میں مبتلا ہوجاتے دیکھتا ہوں تو میرا دل دھڑکنے لگتا ہے اور ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اب جو نگاہ مجھ پر اُٹھے وہ شیریں کی افضال پر نہ ہو بلکہ ایک مالکہ کی خادم پر ہو۔ یہی سبب ہے کہ میں اس کے اس جذبۂ تفوق کی جو قدرتاً اس کے دل میں ہونا چاہئے، تسکین کرتا رہتا ہوں اور گویا اس طرح اس کو بتا دیتا ہوں کہ عورت خواہ کتنی ہی بڑی مدعی ایثار و قربانی کیوں نہ ہو، لیکن میں اس پر اعتبار نہیں کرسکتا۔ آپ کو یہ سُن کر غالباً حیرت ہوگی کہ اس نے اتنے طویل عرصہ میں انتہائی لطف اور مسرت کی گھڑیوں میں بھی کبھی میرے اس طرز عمل پر تنقید نہیں کی اور ایک بار بھی اس نے یہ نہیں کہا کہ اس رسم کی کیا ضرورت ہے مجھے معلوم ہے کہ ایک عورت ہر وقت عورت ہی نہیں رہتی بلکہ وہ کبھی انسان بھی ہوجاتی ہے اور انسان بھی وہ جو صرف جذبات کے لئے جذبات ہی کے ذریعہ سے زندہ رہنا چاہتا ہے اور کوئی فلسفۂ حیات اس کے سامنے نہیں ہوتا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ شیریں کے سمجھنے کے لئے میں نے اپنی انفرادیت کو کس قدر ناقابل فہم بنا دیا ہے، اس میں بار بار غور و تامل ہمیشہ میری فطرت کا معمہ سمجھنے کے لئے پیدا ہوتا ہے اور جب اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوتی، تو اس میں ایک مفتوحانہ انفعال پیدا ہوتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب میرے اندر صحیح معنے میں استغناء کامل پیدا ہوتا ہے۔

آپ باور کیجئے کہ میری نگاہ سے اس قدر ذہین عورت نہیں گزری، خطرات قلب پر آگاہ ہوجانا اس کی ذہانت کا ادنیٰ کرشمہ ہے، خودستائی نہ سمجھئے یہ بھی واقعہ ہے کہ مجھ سا انسان بھی اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شیریں کا وہ زمانہ جب یہ پیرس میں تھی اس کی فتوحات کا عجیب وغریب زمانہ تھا، بڑے سے بڑا انسان جو اس کے دائرۂ تعارف میں آجاتا تھا اس طرح بے بس ہوکر رہ جاتا تھا جیسے جالے میں پتنگا اور پھر اس کی بے اعتنائیوں، بے دردیوں کا وہ عالم ہوتا تھا کہ خدا کی پناہ وہاں کے تمام بلند طبقوں کے لوگ اس کو "قلوبطرۂ ہند" کے لقب سے یاد کرتے تھے، آپ کا وقت تو ضائع ہوگا لیکن میری اس کی اولین ملاقات کی داستان سننے کے قابل ہے وہاں عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ شیریں کو دیکھ لینا محبت کرلینا ہے اور محبت کرلینا تباہ و برباد ہوجانا۔" یہ تھا اس کے حسن و دلربائی کا عالم اور اسی کے ساتھ اس کی خودداری اور تمکنت کا رکھ رکھاؤ۔

میں موسیو ژوردان کا جو پیرس کا مسلم الثبوت ماہر علم الکیمیا ہے، مہمان تھا، میری اس کی ملاقات کیونکر ہوئی۔ یہ دوسری داستان ہے، پھر کبھی سناؤں گا۔ بہرحال میں ژوردان کے ہاں مقیم تھا اور ایک امیر کے ہاں جو ژوردان کا قدیم دوست تھا میں بھی ایک جلسۂ رقص میں مدعو تھا۔ پیرس کی تمام بہترین سوسائٹیوں کا گویا عطر کھنچ کر اس جلسہ میں آگیا تھا۔ شیریں بھی وہاں تھی اور اس شان کے ساتھ کہ پیرس کی [illegible] بڑی خوش وضع اور رنگیلی عورتیں اس پر رشک کر رہی تھیں۔ جب اول اول صاحب خانہ نے میرا تعارف اس سے کرایا

اور اس نے ہاتھ ملایا تو انگلیوں کے مس ہوتے ہی اس نے اپنا سب سے پہلا مشہور حربہ مجھ پر صرف کیا، اس کی نرم و نازک انگلیاں میری ہتیلی سے اس طرح آہستہ آہستہ گزر رہی تھیں گویا وہ کوئی پیام سنا رہی ہیں اور اُس کی نگاہیں اس قدر متین، رحم طلب اور روادارانہ انداز سے میری نگاہوں سے مل رہی تھیں جیسے انھوں نے کوئی اپنی دیرینہ آرزو پالی ہے - میں نے اس کو محسوس کیا اور تھوڑی دیر تک یہ حالت رہی جیسے سیلاب میں کسی کے قدم اُکھڑ جائیں، لیکن چونکہ میں پہلے اُس کی ان مار رکھنے والی اداؤں کا ذکر سن چکا تھا اور یوں بھی کافی تجربہ اس طرح کی دلربائیوں کا رکھتا تھا، اس لئے جب تک وہ اس سحرکاری میں مصروف رہی میں اپنی حالت سے اس کو یقین دلا نا رہا کہ اس کا حربہ خالی نہیں گیا، لیکن جب اس یقین کے بعد اُس نے اپنے پندار میں مجھے نیم بسمل کرکے ہاتھ سے ہاتھ اور نگاہ سے نگاہ جدا کرکے منھ موڑ رہی تھی کہ میں ہنس پڑا، یعنی یہ میرا پہلا حربہ تھا جو میں نے اس کے خلاف استعمال کیا یہ اُس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا اس لئے جب اس نے منھ پھیر کر میری طرف دیکھا، تو میں نہایت ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا اور بولا کہ معاف فرمایئے کبھی دل کا تاثر بھی ہنسی پر مجبور کر دیتا ہے خاصکر جب نیشتر ہلکے قسم کا ہو اس لئے الزام مجھ پر نہیں ہے۔" وہ کچھ دیر تک دیکھتی رہی گویا اب بھی یقین نہ تھا کہ میں ہنسا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ کیا آپ مجھے اجازت دے سکتی ہیں کہ میں آپ کو رقص گاہ تک پہونچا دوں" اس نے تھوڑا سا تامل کرکے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور میں اس کو سہارا دیتا ہوا بڑھا - وہ خاموش تھی لیکن متفکر صورت سے میں بھی خاموش تھا - لیکن عیارانہ انداز سے۔

رخصت ہوتے وقت اس نے مجھے پھر دیکھا لیکن ان نگاہوں سے جو بیک وقت نشہ بخش بھی تھیں اور جرأت آموز بھی میں نے اسے دیکھا لیکن ان نگاہوں سے جو یکسر کیفیات سے خالی تھیں ——— اس کے بعد جلسہ کے دوران میں باوجود اس کی جستجو کے بھی میں اس سے نہ ملا، اور جب اس کو کسی طرف سے آتے ہوئے دیکھا تو قصداً ہٹ گیا، اور اس انداز سے کہ وہ میرے اس احتراز کو سمجھ لے۔

دوسرے دن وہ خود موسیو ژوردان کے مکان پر آئی میں اس سے ملا لیکن ایک سرد خود داری کے انداز سے اور پھر ایک خاص ضرورت کا بہانہ کرکے چلا گیا - اس نے میری نسبت موسیو ژوردان سے بہت گفتگو کی اور جب واپس آیا تو معلوم ہوا کہ وہ چائے پر بلائی گئی ہے اور دوسرے دن دعوتی رقعہ بھی میرے نام کا آ گیا - ژوردان چونکہ اس وقت بہت مصروف تھا اس لئے وہ نہ جا سکا اور تنہا مجھی کو جانا پڑا - شیریں کی دولت و امارت کا حال مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا لیکن اس کے جائے قیام پر جا کر مجھے اس کی پاکیزگی ذوق اور وسعت مطالعہ کا حال بھی معلوم ہوا - اس صحبت میں جو گفتگو اس سے ہوئی اس کی تفصیل تو یاد نہیں مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ جب میں اس سے رخصت ہوا ہوں تو اور زیادہ اس کے لئے معمہ بن گیا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ جستجو و خلش تھی۔

اس کے بعد زمانہ گزرتا گیا، مراسم بڑھتے رہے، تکلف دور ہوا، مختلف وقت و محل کی گفتگو نے مجھے اُن کے اور ان کو میرے ذوق کے سمجھنے میں مدد دی لیکن جس حد تک رابطۂ جنسی کا تعلق ہے وہ میرے لئے چیستاں تھیں اور میں ان کے لئے عقدۂ مشکل - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں میرے لئے خاص مرکزیت پیدا ہونے لگی اور ان کی دلچسپیاں محدود ہو کر رفتہ رفتہ صرف میری ذات سے متعلق ہو گئیں، لیکن حالت یہ تھی کہ ہم دونوں گویا دو شعلے تھے جو علحدہ علحدہ جل رہے تھے، اور باوجود شدید تمایل کے ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے تھے - میں یہ کہنا بھول گیا کہ پہلی ملاقات کے دو ماہ بعد ہی میری خدمات ایک سکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے حاصل کر لی تھی اور اب میں شب و روز انھیں کے ساتھ رہتا تھا۔

آپ یہ سُن کر حیرت کریں گے کہ کامل چار سال اسی عالم میں گزر گئے ہیں اور میں اپنی اس رہبانیت میں خاص قسم کی لذت محسوس کرنے لگا ہوں، ادھر ان کا یہ عالم ہوا کہ شوخیاں متانت میں، لہو و لعب سنجیدگی میں اور فرصت کے تمام اوقات نہایت عمیق غور و فکر میں بسر ہونے لگے - آپ ان کے اولین نقوش اُٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بعد کے نقوش سے وہ کس قدر متباین ہیں - آپ کو جو خط میں نے لکھا تھا ہر چند وہ بالکل حقیقت کے خلاف تھا، لیکن میری تمنا کے بالکل موافق - پہلے دن جب آپ آئے اس وقت بھی میں نے آپ کو دھوکا دینا چاہا، لیکن اب چونکہ آپ سے اس مسئلہ میں صحیح مشورہ کرنا تھا اس لئے ضرورتاً یہ سب بیان کرنا پڑا۔

دنیا جو چاہے سمجھے لیکن اس کو میں ہی جانتا ہوں کہ یہ برسوں کی الفت کس طرح اب تک ناشگفتہ حالت میں پڑی ہے۔ اگر اس وقت تک کی میری ان کی صحبتوں اور خلوتوں کی گفتگو کو تحریر میں لے آیا جائے تو بہترین عاشقانہ لٹریچر فراہم ہو سکتا ہے، لیکن حقیقت و معنی کے لحاظ سے، شاید ہی کوئی دفتر اس سے زیادہ مہمل و لایعنی نظر آئے۔

شادی کا سوال براہ راست تو نہیں ضمنی طور پر بار ہا پیدا ہوا لیکن آخر کار میں اور وہ دونوں اسی نتیجہ پر پہونچے کہ شادی نام ہے صرف باہمی غلط فہمی اور ایک سخت لذت شکن نتیجہ کا اس لئے اب کوئی صورت سوائے اس کے نہیں ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں یا پھر وہ کر دل جو شادی سے بہتر لیکن انسانیت سے بہت فروتر ہے۔

دریں روش مچہ امید دل تواں بستن
میانۂ من و داد شوق حائل افتادست

کل کے اکتشافات ایسے نہ تھے کہ میں یوں آسانی سے رات بسر کر لیتا، سوچتا رہا کہ افضال نے جو کچھ کہا وہ ناممکن تو نہیں ہو سکتا لیکن اس کے لئے ممکن ہونا ایک حد تک ضرور ناممکن معلوم ہوتا ہے غالب کا یہ شعر بار بار مجھے یاد آیا اور سوچتا رہا کہ اگر افضال کا بیان درست ہے تو پھر اس کے نفسیاتی توجیہ اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ:-

میانۂ من و داد شوق حائل افتادست

کیونکہ شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے بیں نہ اس نزاکت کا قایل ہوں کہ:-

"ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے"

اور نہ اس خلاف جذبہ کا کہ:-

"میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے"

یہ سب تاویلاتِ بدنصیبی ہیں، ورنہ جن ہونٹوں کا نکھار بھی حوصلہ افزا ہو ان کے اقرار کا کیا کہنا ——

—— بہرحال صبح ہونے کے بعد محض بربنائے شوق جستجو جی چاہا کہ کچھ وقت تنہائی شیریں کا مل جاتا تو اس باب میں اسکے خیالات بھی معلوم کرتا۔ میں اب جلد واپس جانا چاہتا تھا —— میں نے گھبرا کر سامنے میز سے کاغذ کا ایک پرزہ لیا تا کہ اس کو اطلاع دوں، اتنے میں افضال آ گیا، میں نے اس سے ذکر کیا تو وہ ہنسا اور بولا کہ:-

"نہیں اب اس کی ضرورت نہیں رہی، جو دنیا کل تھی آج نہیں ہے، آپ سے گفتگو کرنے کے بعد حالات میں بہت انقلاب پیدا ہو گیا اب میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ شیریں سے بہت جلد جدا ہو جاؤں گا۔ کیونکہ انسان اپنی زندگی میں بہت سے کھیل ایسے بھی کھیل سکتا ہے جس کو کمیڈی یا ٹریجڈی بننے سے پہلے ہی ختم ہو جانا چاہئے"

میں نے اسے تعجب سے دیکھا اور پھر بالکل بے اختیارانہ طور پر دریافت کیا۔ "کب" —— "شاید آج ہی ابھی"

سارا دن گزر گیا اور شیریں سے ملاقات نہ ہو سکی، وہ کسی خاص معاملہ میں اپنے مشیر قانونی سے مشورہ کرنے گئی تھی، اس کے جانے کے بعد افضال سے یہ مختصر گفتگو ہوئی اور پھر اس کا بھی پتہ نہ چلا۔ شام کو وہ واپس آئی تو بہت مسرور نظر آتی تھی، مجھے دیکھتے ہی پوچھا "افضال ہیں" میں نے کہا "وہ تو آپ کے بعد ہی فوراً چلے گئے اور پھر نہیں آئے" وہ یہ سن کر کچھ سوچتی ہوئی اپنی خوابگاہ میں داخل ہو گئی اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے اندر بلا کر کہا "آپ نے کچھ اور بھی سنا، یہ دیکھئے آپ کے افضال صاحب میرے نام ایک خط چھوڑ گئے

ہیں ملاحظہ کیجئے :-

۱۹ر نومبر - ۸ بجے صبح

میری آپ زندگی کا افتراق، جسے دنیا نے ہمیشہ اپنی غلطی سے یا ہم لوگوں کی غلط تعبیر حیات سے اتحاد سمجھا اس وقت سے متوازی چل رہا ہے، جب آپ نے تھک کر اور میں نے آپ کو تھکا ہوا جان کر، ایک راستہ کو بغیر جانے بوجھے منزل تک پہونچنے والا سمجھ کر اختیار کرلیا۔ پھر جس طرح دو ہمسفر مسافر اس اندیشہ کی بنا پر کہ دوسرا تنہائی میں، اس کی دولت نہ لوٹ لے، ایک محتاط خاموشی کے ساتھ راستہ کاٹ دیتے ہیں۔ اسی طرح میں نے اور آپ نے یہ سفر اختیار کیا اول اول تو اس نے بہت لطف دیا، کیونکہ یقین تھا کہ منزل پر پہونچنے کے بعد خاموشی وضبط کا یہ کھیل اس طرح ختم ہو جائے گا کہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑیں گے اور گلے مل جائیں گے لیکن بعد کو ہم نے محسوس کیا کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ منزل کا نشان کچھ دھندلا ہوتا جاتا ہے اور راستہ کی اٹھکھیلیاں سنجیدگی میں تبدیل ہورہی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ اپنی جگہ کن جذبات کو لئے ہوئے تھیں لیکن جہاں تک میں نے غور کیا، آپ کے اوقات بھی چند دن بعد اس فکر میں بسر ہونے لگے کہ نقاب کے نیچے کا اصلی چہرہ کیونکر دکھایا جائے اور جس "غلط" کو "صحیح" بنا کر پیش کیا گیا ہے، اس کو کس طرح مٹایا جائے پھر اس تمثیل کی دنیا میں، آپ نے کتنے دن زندگی بسر کی؟ اس میں شک نہیں کہ یہ زمانہ چند سال کا تھا لیکن جب اسے گزارنا پڑا تو معلوم ہوا کہ مکروفریب کی زندگی کا ہر ہر لمحہ ایک مستقل "گرانجانی" ہوتا ہے اور اس کا تحمل بسا اوقات بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

ہم لوگ جس تہذیب کے عادی ہو گئے ہیں اس کی مثال ایک بازیگر کا صندوق ہے جس کے اندر سے وہ ہر مرتبہ ہاتھ ڈال کر ایک ہی چیز کو مختلف صورتوں میں پیش کرتا ہے، درانحالیکہ حقیقت ان سب سے جدا ہے چنانچہ اس وقت بھی جبکہ میں تمام رشتوں کو توڑنے کے لئے آمادہ ہوں اتنی جرأت نہیں کرسکتا کہ جو کہنا ہے صاف صاف کہہ دوں، بلکہ وہی پیچیدگی وہی ایک ایک جملہ میں بیسیوں معنی زاویے وہی "کجا می نماید کجا می زند" کی قسم کا انداز بیان اب بھی قایم ہے۔ خیر بہرحال کوشش کروں گا کہ کم از کم اپنے چہرہ سے تو نقاب اُلٹ ہی دوں - سنئے، دنیا میں مرد و عورت کی یکجائی اس حال میں کہ وہ یکذات نہیں ہیں اس قدر مہمل و بے معنی چیز ہے کہ کوئی ذی عقل اس کی تاویل کر ہی نہیں سکتا احسان کی وہ حد نہایت ہی خطرناک ہوتی ہے جب دوسرا اپنے عدم استحقاق کو محسوس کرنے لگے اور میرے خیال میں محسن کشی کے جذبات اسی جگہ پہونچکر پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس لئے آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگر آج میں اپنے آپ کو آپ سے منحرف پاتا ہوں تو اس کا سبب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ مجھ میں اب آپ کے الطاف وکرم کے برداشت کرنے کی تاب نہیں ہے اور میں ایسا محسوس کرنے لگا ہوں کہ آپ اپنی عنایتوں سے اس حال میں کہ میں ان کا مستحق نہیں ہوں مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہیں۔

بہرحال آج میں اپنے دل کی بغاوت کا آپ سے اعلان کرتا ہوں اور مجبور ہوں کہ کوئی راہ اپنی زندگی کی ایسی نکالوں جو جسمانی حیثیت سے خواہ کیسی ہی مجروح کیوں نہ ہو، لیکن روحانی حیثیت سے بے نیاز اور پرسکون ہو۔

اب جو کبھی سوچتا ہوں کہ اتنے دن میں نے کیوں اور کس امید پر آپ کے ساتھ بسر کئے تو "ساحل و موج کا تعلق میرے پیش نظر ہو جاتا ہے اپنی تشنہ لبی" کے جمود پر افسوس کرتا ہوں، ممکن ہے آپ کو اپنی "تموج آبی" پر اب بھی فخر و ناز ہو۔ بہرحال جس طرح ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے، اسی طرح میرے صبر و ضبط کی بھی ایک عمر تھی جو آج ختم ہو گئی اور میں اس کی موت کا اعلان کھلم کھلا کر رہا ہوں۔

میں چند دن سے اس مسئلہ پر غور کر رہا ہوں کہ جب دنیا میں رہنا ہے، تو اس کے مقرر کردہ اصول پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، اور اس لئے وہ ایک تلخ گھونٹ کی طرح ازدواج کے غیر شاعرانہ طریقہ کو بھی برداشت کرنا چاہئے، لیکن چونکہ

آپ کی طرح میں نے بھی اس کو کبھی پسند نہیں کیا تھا اس لئے کہنے کی جرأت نہ ہوئی اب بھی اس کا ذکر اس لئے نہیں کرتا کہ آپ مان ہی لیں، بلکہ صرف اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ آپ اُس کے بعد مجھ سے نفرت ہی کرنے لگیں اور اس طرح مجھے ہمیشہ کے لئے مایوس ہوجانے کا بہانہ ہاتھ آجائے۔

چونکہ میں اب اس معاملہ میں زیادہ رومان پیدا کرنا مناسب نہیں سمجھتا، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ میں ایک خودکشی کرنے والے کی طرح ایسی اطلاع دوں جس کا کوئی علاج ممکن نہ ہو میں ابھی یہیں رہوں گا اور سیول ہوٹل میں قیام کرونگا۔

میں سمجھتا تھا کہ اس خط کا شیریں پر بڑا اثر ہوگا، اور ممکن ہے کہ ایک عورت کی طرح اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آجائیں، لیکن یہ دیکھکر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ وہ بہت مسرور و مطمئن تھی اور جسوقت میں خط پڑھ چکا تو ایک ایسے قہقہہ کے ساتھ جو میں نے کبھی نہیں سنا تھا اس نے وہ خط مجھ سے واپس لیا اور کہا کہ "مہربانی کرکے آپ افضال کے کمرہ میں جائیے اور دیکھئے ان کے نام کا کوئی خط تو وہاں نہیں ہے، اگر ہو تو لیتے آیئے"

میں گیا تو ایک لفافہ اُن کے نام کا میز پر موجود تھا، میں اس کو لے آیا۔ اس نے دیکھ کر کہا کہ "آپ کو زحمت تو ہوگی، لیکن مجھے امید ہے کہ آپ یہ تحریر ان تک اسی وقت پہونچا دیں گے"

مجھے پہلے کچھ حیرت ہوئی کہ یہ کیا قصہ ہے لیکن اس کے سمجھنے سے زیادہ ضروری یہ معلوم ہوا کہ کسی طرح افضال سے جاکر ملوں۔

جس وقت میں پہونچا تو وہ برآمدہ میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرایا اور بولا کہ "میں سمجھتا تھا کہ آپ آئیں گے" میں نے کہا:- "مگر یہ تو نہ معلوم تھا کہ آئیں گے اور کچھ ساتھ لائیں گے" میں نے وہ خط اسے دیا اور جب اس نے کھولا تو یہ معلوم کرکے سخت حیرت ہوئی کہ شیریں یہ خط دو گھنٹے قبل لکھ چکی تھی۔

خط بہت مختصر تھا لیکن توارد خیالی کی عجیب و غریب مثال۔ اس کا مضمون یہ تھا:-

۱۹ نومبر ۶ بجے صبح

میری آپ کی خاموش جنگ آج ختم ہوتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ میں اپنی شکست کا اعتراف کرتی ہوں اور میرا یہ خط لکھنا گویا آپ کے سامنے سپر ڈال دینا ہے۔

بہرحال اب چارۂ کار سوا اس کے کوئی نہیں کہ خیالی دنیا کی زندگی ختم کرکے سوسائٹی کے اصول پر کاربند ہوں اور وہی کروں جو اس سے قبل کرنا چاہئے تھا۔

آج میں اپنے مشیر قانونی سے گفتگو کرکے، کل ہمیشہ کے لئے عمل کے لحاظ سے بھی وہی ہو جاؤں گی جو اب تک خیال کے لحاظ سے تھی

یعنی　　آپ کی ہمیشہ

شیریں

شام کے وقت وہ منظر بھی کس قدر دلکش تھا کہ افضال و شیریں دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور افضال اس امر پر متاسف تھا کہ کیوں نہ اس کو شیریں کا خط پہلے مل گیا اور شیریں اس بات پر نادم کہ کیوں اُس نے خط لکھنے میں دو گھنٹہ کی عجلت کی۔

یہ بھی قدرت کی ستم ظریفیاں ہیں کہ پہلے تو پورے چھ سال ان دونوں نے اس کوشش میں بسر کردئے ایک دوسرے پر غالب ہوکر نتیجہ پہونچیں اور پھر جب فیصلہ کا وقت آیا تو صورت یہ پیدا کر دی کہ دونوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ شکست کا معترف تھا۔ میں نے یہ منظر دیکھا اور دونوں کو مخاطب کرکے کہا کہ:-

"وہ صلح جو فریقین کی شکست پر قایم ہوتی ہے زیادہ مستحکم ہوا کرتی ہے" انھوں نے سُنا اور ایک دوسرے کو دیکھکر مُسکرا پڑے۔

آزاد نظم اُردو شاعری میں

پروفیسر کنول آبالی - جموں

ظاہری ساخت کے لحاظ سے اُردو شاعری کی تین شکلیں ہیں - (۱) پابند شاعری - (۲) نظم معرّیٰ - (۳) آزاد نظم۔

پابند شاعری پابند شاعری میں بحر و قافیہ کی پابندی ہے ——— اور تمام اصنافِ سخن میں اس کا لحاظ ضروری ہے مثلاً غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی، مسمط -

غزل :- غزل کا ہر شعر دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مطلع (پہلا شعر) کے دونوں مصرعوں میں اور اس کے بعد ہر شعر کے مصرعۂ ثانی میں قافیہ ضروری ہے - شعروں کی کوئی خاص تعداد معین نہیں ہوتی۔ معنوی لحاظ سے اس صنف میں اکثر عشقیہ مضامین باندھے جاتے ہیں - مگر رندانہ، فلسفیانہ اور دیگر موضوعات بھی شاملِ غزل ہیں اور یہ التزام کیا جاتا ہے کہ ہر مضمون کا بیان ایک شعر میں مکمل ہو جائے ایک ہی موضوع پر مسلسل غزل بھی لکھی جا سکتی ہے - اس صورت میں غزل کے ہر شعر میں ایک ہی مضمون کی مزید توضیح کی جاتی ہے -

رباعی :- چار مصرعوں کی مختصر نظم کو رُباعی کہتے ہیں - اس میں ی ایک بات یا خیال کو دو اشعار میں نہایت اختصار سے نظم کرنا لازم ہے۔ رباعی کے لئے چوبیس اوزان مخصوص ہیں - جو بحر ہزج کے ساتھ زحاف لانے سے ترکیب پاتے ہیں - اس طرح جو چار مصرعے ان چوبیس اوزان میں سے کسی وزن پر ہوں' رُباعی کہلاتے ہیں - نیز دونوں اشعار میں پہلا' دوسرا' چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے -

قطعہ :- ایک طرح کی مسلسل نظم ہوتی ہے - اس کے مطلع میں قافیہ نہیں ہوتا - بلکہ قافیہ کی بنا پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ پر ہوتی ہے مسلّمہ قاعدہ کے مطابق قطعہ میں کم سے کم دو شعر اور زیادہ سے زیادہ سترہ شعر ہوتے ہیں - لیکن بعض شعراء نے اس سے بھی زیادہ اشعار کے قطعے لکھے ہیں -

مثنوی :- مثنوی میں ہر شعر میں مصرع اول اور ثانی ایک قافیہ کے لکھے جاتے ہیں - اس پابندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جتنے شعر چاہیں لکھ سکتے ہیں - یہ صنف عام طور پر طویل اور مسلسل مضامین کے بیان کے لئے استعمال کی جاتی ہے - خاص کر قصّے، کہانی، تاریخی واقعات - رُباعی کی طرح مثنوی کے لئے بھی چند بحریں مخصوص کی گئی ہیں -

مسمط :- مسمط میں شعر بندوں کی صورت میں لکھے جاتے ہیں - تین یا تین سے زیادہ مصرعوں کا ایک بند ہوتا ہے - کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ دس مصرعے ایک وزن پر لکھے جاتے ہیں - اس طرح کہ ہر بند کے آخری مصرعہ کا قافیہ ایک اور باقی مصرعے ایک قافیہ کے ہوتے ہیں اسی نہج پر پانچ مصرعوں والے بند (مخمس) چھ مصرعوں والے (مسدس) سات مصرعوں والے (مسبع) اور آٹھ، نو اور دس مصرعوں والے بند مثمن، متسع، اور معشر لکھے جاتے ہیں' وغیرہ -

اس سے پہلے کہ نظم معریٰ اور آزاد نظم کی ظاہری ساخت اور ٹکنیک کی وضاحت کی جائے - عروض کی پیدائش اور اُردو شاعری میں فارسی' عربی عروض سے متعلق چند باتیں کہنا نامناسب نہ ہوگا - بعض کے نزدیک علمِ عروض کے بغیر شاعری کا کوئی وجود ممکن نہیں دراصل یہ ایک بڑی غلطی ہے - حقیقت یہ ہے کہ علمِ عروض شاعری سے بعد کی پیداوار ہے - بعینہٖ جس طرح زبانیں پہلے وجود میں آتی ہیں اور ان کے قواعد بعد میں مرتب کئے جاتے ہیں - شعر بھی علمِ عروض سے پہلے وجود میں آیا ہے - رہا یہ سوال کہ پہلے پہل شعر کی ظاہری ساخت

کیا رہی ہوگی۔ ماہرینِ فنونِ لطیفہ نے کچھ مشاہدوں کی بنا پر شاعری کی پیدائش کے متعلق قیاس آرائیاں کی ہیں۔ ہمیں بعض باتوں میں ان سے اختلاف ہو سکتا ہے، مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ شاعری انسانی زندگی سے باہر کوئی وجود نہیں رکھتی اور شاعری کے لئے زبان اولین شرط ہے۔ اس سچائی کے پیشِ نظر محققین کا یہ خیال بے جا نہیں کہ قرونِ اولیٰ میں شدتِ جذبات کے اظہار کے موقعوں پر انسان کی زبان سے بے شعوری طور پر کچھ آوازیں نکلتی ہوں گی جن کا لہجہ عام بول چال کے لہجہ سے ضرور مختلف ہوتا ہوگا۔ زبان کے اس لہجہ کو مغربی مفکروں نے (Highlened form of ordinary speech) کی وہ شکل مانی ہے جو عام بول چال سے بلند ہو۔ اسے ہم زبان کا جذباتی لہجہ کہہ سکتے ہیں جو عام گفتگو سے زیادہ موثر رہا ہوگا۔ بعد میں جب انسان کو زبان کے اس لہجہ کی تاثیر کا شعور حاصل ہوا تو آہنگ اور توازن کی فطری خصوصیات کے مدِنظر بحر و قافیہ کے اصول مرتب کر لئے گئے۔ اس طرح علم عروض کی بنیاد پڑی۔ عروضی اصول وضوابط کے مطابق شاعری کا رواج ہوا۔ اور بڑھتے بڑھتے روایت کی شکل اختیار کر گیا۔ مثال کے طور پر آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے عرب میں عروض کا وجود نہ تھا۔ اس وقت بھی لوگ شعر کہتے تھے۔ عربی شاعری میں اس عہد کے شعرا نے قابلِ قدر اور بلند پایہ نمونے چھوڑے ہیں۔ اس عہد میں شاعر شدتِ جذبات کے اثر سے بے ساختہ طور پر زبان میں ایک ایسا آہنگ اور ترنم پیدا کر لیتے تھے جس میں وزن بھی ملتا ہے اور قافیہ بھی، آٹھویں صدی عیسوی میں عرب کے ایک نامور عالم خلیل ابن احمد نے عربی کی قدیم اور خود رو شاعری کے مطالعہ اور یونانی عروض کی جانچ پرتال سے عربی عروض ایجاد کیا اور بحر و قافیہ کے اصول وضوابط مرتب کئے۔ عربی نقاد عرصہ دراز تک شاعری کو "موزوں مقفیٰ" کلام ہی گردانتے رہے۔ ابن رشیق، ابن خلدون اور دسویں صدی ہجری کے ایک مصنف احمد بن مصطفےٰ کی تصانیف میں شاعری کی ماہیت سے بحث کرتے ہوئے یہی رائے قائم کی گئی ہے[1] جب ایران پر عربوں کا غلبہ ہوا تو فارسی شعراء نے بھی عربی عروض کو معمولی ردّ و بدل کے ساتھ اپنا لیا۔ اُردو نے ایک زبان کی شکل اختیار کرنے کے بعد فارسی سے بھی مستعار لیا۔ اُردو کی لسانی خصوصیات کی بنا پر بدیسی تقطیع کے اصولوں میں کچھ تنسیخ و ترمیم کے بعد ہندوستان میں بھی اس کا رواج عام ہو گیا۔ ابتدائی دکنی شاعری کو چھوڑ کر جس کا کچھ حصہ ہندی پنگل کے مطابق ہے، اُردو کی کلاسیکی شاعری اسی عربی، فارسی عروض کی پابند ہے۔ بعد کے شعراء نے روایت کے طور پر اسی عروض کا سہارا لیا اور اُنیسویں صدی کے آخر تک اُردو شاعری میں کلاسیکی عروض کی تقلید جاری رہی۔ صرف بیسویں صدی کے آغاز میں پہلی بار مغربی شاعری کے مطالعہ سے ہمارے شاعروں نے یہ سوچا کہ کلاسیکی پابندیوں کے بغیر بھی شاعری ہو سکتی ہے اور اس طرح ہمارے یہاں نظم معریٰ اور آزاد نظم کا تصور مغربی شاعری سے اخذ کیا گیا ہے اور اُردو کی لسانی خصوصیات پر نگاہ رکھتے ہوئے نظم معریٰ اور آزاد نظم لکھنے کے چند طریقے ایجاد کر لئے گئے ہیں۔ جدید اُردو شاعری میں پابند شاعری کے ساتھ ساتھ معریٰ اور آزاد نظمیں بھی لکھی جاتی ہیں

نظمِ معریٰ

نظم معریٰ میں قافیہ اور ردیف کی کوئی قید نہیں مگر بحر کی پابندی لازم ہے۔ اس میں بھی ہر مصرع کا وزن ایک ہوتا ہے۔ سولھویں صدی میں انگریزی میں ڈرامائی موضوع کے لئے اس فارم سے بہت کام لیا گیا ہے۔ انگریزی شاعری نے قدیم یونانی اور لاطینی شاعری سے اس فارم کو لیا تھا۔ اور قدیم اصنافِ سخن میں سے ایک صنف اس طرز کے لئے مخصوص کر دی تھی شیکسپیر کے منظوم ڈرامے اسی فارم میں ہیں۔ نظم معریٰ کو انگریزی میں "بلینک ورس" کہتے ہیں، اُردو میں بیسویں صدی کے آغاز میں سب سے پہلے عبدالحلیم شرر، اسمٰعیل میرٹھی اور نظم طباطبائی نے اس فارم میں تجربے کئے۔ ہمارے ہاں انگریزی کی طرح اس فارم کے لئے کوئی خاص بحر مخصوص نہیں کی گئی۔ بلکہ عروضی بحور میں سے سالم یا مزاحف کسی بحر میں بھی معریٰ طریقہ کار برتا جا سکتا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے عبدالحلیم شرر کے منظوم ڈرامے "فلورنڈا" سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایک منظر میں ہیرو کو اپنی محبوبہ فلورنڈا کا خیال آتا ہے اور وہ اپنے آپ سے کہتا ہے ؎

---

[1] بحوالہ جدید اُردو شاعری مصنف عبدالقادر سروری

جس کو دیکھو خوش ہے۔ لیکن۔ آہ اِک میں ہوں کہ دل
کو قرار آتا نہیں ۔ اُلجھن ہے ۔ بیتابی ہے اور
ہر گھڑی اِک درد ہے۔ پیاری فلورنڈا تجھے،
اِک نظر دیکھوں تو چین آئے، کہاں میرے نصیب
میں تڑپتا ہوں یہاں تو اُندلس کے باغوں میں
سیر کرتی ۔ ناز سے اٹھلاتی ۔ ہنستی بولتی
کھلکھلاتی، توڑتی پھولوں کو ۔ پھر اُن کو عجب

اس کا وزن فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن ہے۔

اس ڈراما میں ہر مصرعہ کا وزن بحر کے لحاظ سے برابر ہے۔ صرف قافیہ کا روایتی نظام برقرار نہیں رکھا گیا۔ جہاں مکالمہ کی ضرورت کے مدِ نظر بحر کے ارکان کو توڑ کر بکھیر دیا گیا ہے۔

آزاد نظم ہمارے ہاں آزاد نظم کا تصور بھی آج سے پچیس تیس سال پہلے مغربی شاعری کے ذریعہ آیا ہے۔ اس فارم کا آغاز اُنیسویں صدی میں پہلے فرانس میں ہوا۔ بعد میں یورپ کی زبانوں اور انگریزی میں بھی اس کا رواج عام ہوگیا۔

اس فارم کی بنیاد اس نظریہ پر رکھی گئی ہے کہ شاعری کا انحصار موضوع پر ہو نہ کہ ہیئت پر۔ اس نظریے سے شاعری میں آزادِ اظہار کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جس کے پیشِ نظر معین اصنافِ سخن اور بحور اور قافیہ کی روایتی پابندیوں سے بغاوت کی گئی ہے۔ نظم معریٰ میں صرف قافیہ کی قید سے نجات ملی تھی، آزاد نظم میں شاعر نے بحر اور قافیہ دونوں سے آزادی حاصل کرلی ہے۔ اُردو شاعری میں موضوع کے آزاد اظہار و ابلاغ کے لئے ہمارے شاعروں نے جو طریقہ ایجاد کیا ہے اُسی سے آزاد نظم عبارت ہے۔ انگریزی میں روایتی بحور سے مکمل گریز کیا گیا ہے اور عروضی قید و بند کا مطلق لحاظ نہیں کیا گیا۔ اُردو میں روایتی عروضی بحور سے مکمل گریز نہیں کیا گیا۔ بلکہ بحور کے استعمال میں صرف قدیم طریقہ سے انحراف کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہماری پابند شاعری کی مثالوں سے واضح ہے، دوسری زبانوں میں بھی پابند نظم میں ہر مصرع کا وزن مساوی ہونا شرط ہے۔ ہر مصرع کا وزن یا موسیقیانہ زیر و بم بحر کے معین الاصول پر پورا اُترنا چاہئے۔

بحور کے سلسلہ میں مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر ادبی و علمی زبان میں شاعری کے لئے آہنگ موسیقی اور وزن کے مختلف پیمانے مہیا کئے گئے ہیں۔ ان میں آوازوں کے اُتار چڑھاؤ یا حروف کی تعداد و ترکیب کو زبان کی آہنگ موسیقی کے پیشِ نظر ترتیب دیا گیا ہے۔ اور چونکہ ہر زبان کی موسیقی یا سنگیت کا معیار جدا ہوتا ہے۔ اس لئے زبان کی عروضی اکائیوں میں بھی فرق ہوگا اور بحور میں وزن کے اصول بھی جدا ہوں گے۔ ہندی زبان میں اوزان دو طرح سے بنتے ہیں، حروف کی گنتی سے یا آوازوں کے ٹکڑوں سے انگریزی زبان میں حروفِ تہجی عروض کی بنیاد ہیں۔ عربی عروض کی بنیاد حرفوں کی حرکت اور سکون پر رکھی گئی ہے۔ اُردو میں (ہندی، اُردو) زبان کے چھوٹی مدہم آوازوں والے حروف کو ساکن مان کر قدماء نے عربی عروض کو اپنایا ہے۔ پابند شاعری میں شاعر کو اپنا مفہوم ایسے الفاظ میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ جن کی ترکیب و ترتیب بحر کے معین نظام کے عین مطابق ہو۔ انگریزی میں موضوع اور معنی کے آزاد اظہار کے لئے جو راہ اختیار کی گئی ہے۔ اس میں کسی قسم کی خارجی پابندی نہیں، خیال اور جذبہ کا داخلی آہنگ اور ترنم ہی شاعر کی رہبری کرتا ہے۔ اُردو زبان کی ساخت انگریزی سے بہت مختلف ہے۔ لفظ کے کسی جزو پر زور دے کر پڑھنا اُردو میں نہیں ہے اور شاید اسی وجہ سے عروضی بحور کا سہارا قطعی طور پر ترک نہ کر سکے اس کا طریقہ یہ ہے کہ مافی الضمیر کے داخلی آہنگ یا ذہنی ترنم کے مناسب عروضی بحور میں سے کوئی ایک بحر چن لی جاتی ہے۔ بعد ازیں عروضی بحور کے مروجہ قواعد کو نظر انداز کر کے منتخب بحر کا آزاد استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی مصرعوں میں ارکان کی تعداد پابند شاعری کی طرح پہلے سے معین نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کا انحصار کسی بات یا خیال کے ایک جزو کی تکمیل پر ہوتا ہے۔

بیان کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور بحر میں لچک پیدا ہو جاتی ہے یعنی وہ جذبہ اور خیال کے ساتھ سکڑتی اور پھیلتی ہوئی متحرک رہتی ہے کہیں کہیں ایک ساتھ دو یا دو سے زیادہ مصرعوں کا وزن برابر ہوتا ہے۔ اس طرح کہیں کہیں قافیہ بھی ایک ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بات آزاد نظم کے لوازم میں شامل نہیں۔ کبھی خیال کی رو میں بے شعوری طور پر ایسا ہو جاتا ہے اور کبھی موسیقیانہ تنوع کی خاطر شاعر شعوری طور پر وزن اور قافیہ ملا دیتا ہے۔ اس طریق کار میں مصرعوں کے ارکان کی تعداد میں فرق ہونے کے باوجود تسلسل، روانی اور موسیقی قایم رہ سکتی ہے۔ آزاد نظم کے سب سے بڑے علمبردار ن۔ م۔ راشد اور میراجی کے علاوہ سردار جعفری اور بعض دوسرے شعراء کے ہاں اس طریقہ کار کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

تیرے رنگیں رس بھرے ہونٹوں کا لمس
اور پھر لمسِ طویل
جس سے ایسی زندگی کے دن مجھے آتے ہیں یاد
میں نے جو اب تک بسر کی ہی نہیں
اور اک ایسا مقام
آشنا جس کے نظاروں سے نہیں میری نگاہ

راشد نے اس نظم میں بحر رمل مثمن مقصور (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات) کا آزاد استعمال کیا ہے۔
دوسری مثال کے لئے میراجی کی نظم "رس کی انوکھی لہریں" کا پہلا بند ملاحظہ ہو۔ اس میں بحر متقارب "فعولن فعولن فعولن فعولن" کا آزاد استعمال کیا گیا ہے۔

میں یہ چاہتی ہوں کہ دُنیا کی آنکھیں مجھے دیکھتی جائیں، یوں دیکھتی جائیں جیسے
کوئی پیڑ کی نرم ٹہنی کو دیکھے
(لچکتی ہوئی نرم ٹہنی کو دیکھے)
مگر دو جہ پیتوں کو اُترے ہوئے پیرہن کی طرح سیج کے ساتھ ہی فرش پر اک مسلا ہوا
ڈھیر بن کر پڑا ہو

سردار جعفری نے اپنی طویل آزاد نظم "ایشیا جاگ اُٹھا" میں بحر متقارب مقبوض "فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن" کا آزاد استعمال کیا ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں:۔

یہ ایشیا کی زمیں، تمدن کی کوکھ تہذیب کا وطن ہے
یہیں پہ سورج نے آنکھ کھولی
یہیں پہ انسانیت کی پہلی سحر نے رُخ سے نقاب اُلٹی
یہیں سے اگلے یگوں کی شمعوں نے علم و حکمت کا نور پایا
اسی بلندی سے وید نے زمزمے سنائے

اردو آزاد نظم سے متعلق بعض لوگوں نے کہیں کہیں اشارتاً تحریر کیا ہے کہ بعض شعراء نے وزن اور بحر سے بے نیاز آزاد نظمیں لکھی ہیں یا من مانا وزن اختیار کیا ہے۔ ثبوت میں خاص کر میراجی اور ن۔ م۔ راشد کا نام پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے راشد اور میراجی کی کوئی آزاد نظم وزن اور بحر سے بالکل بے نیاز نظر نہیں آتی نہ ہی کسی نے من مانا وزن اختیار کیا۔ بعض اوقات تقطیع میں غلطی کرنے سے شبہ ہوتا ہے۔ مقررہ بحروں میں عروضی اصولوں کے مطابق تبدیلیاں ضرور لائی گئی تھیں۔ ایسی مثالوں سے یہ مراد نہیں

لی جا سکتی کہ شاعر نے کوئی من مانا وزن اختیار کیا ہے۔ من مانا تب ہو سکتا ہے۔ جب عروضی قواعد کے خلاف کوئی رکن طوار کیا جائے۔ ابھی تک اُردو کے کسی شاعر نے آزاد نظم میں بحر اور ارکان سے قطعی طور پر انحراف نہیں کیا۔ میراجی کی بعض نظموں میں نثریت کا رجحان پایا جاتا ہے۔ دیکھنے والا قیاس کرتا ہے کہ شاید ان نظموں کا ہندی پنگل سے تعلق ہے۔ لیکن تقطیع کرنے سے میراجی کی تمام نظمیں اُردو عروض کے ارکان پر پوری اُترتی ہیں۔ عظمت اللہ خاں کے سوا آج تک اُردو کے کسی شاعر نے ہندی پنگل سے استفادہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مقبول حسین احمد پوری اور اندرجیت شرما کے ہندی آمیز گیت کا بھی ہندی پنگل سے کوئی رشتہ نہیں عظمت اللہ خاں نے بھی ہندی کی ماترک بحر میں صرف دو تین گیت ہی لکھے ہیں۔ ان کو چھوڑ کر قابل قدر نظمیں اور گیت اُردو کی بحروں میں ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ اُردو کی بعض بحریں ہندی پنگل کی بعض بحروں سے مطابقت رکھتی ہیں۔ جیسے اُردو کی بحر متدارک مخبون (فعلن فعلن فعلن فع) ہندی کی ایک بحر "سارونی" کے وزن پر پوری پوری اُترتی ہے۔[1]

مستزاد اور آزاد نظم اُردو کی پابند شاعری میں ایک ایسی صنف بھی شامل ہے جو ظاہری ساخت کے اعتبار سے آزاد نظم سے کچھ مماثلت رکھتی ہے۔ اسے مستزاد کہتے ہیں۔ اِس فارم کو بظاہر دیکھنے سے آزاد نظم کا شبہ گزرتا ہے۔

مستزاد میں غزل، رُباعی، قطعہ یا اور کسی نظم کے ساتھ ایک فقرہ موزوں ملحق کر دیتے ہیں۔ جو نظم کی بحر کے ارکان ہی سے ہوتا ہے۔ مستزاد کے نمونے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جس صنفِ سخن کے ساتھ مستزاد کے فقرے لگاتے ہیں نہ صرف اس میں عروضی بحور اور قافیہ کی پابندی کا التزام ہوتا ہے بلکہ مستزاد کے تمام فقروں کا ہم وزن ہونا بھی ضروری ہے۔ اور عموماً قافیہ بھی روایتی معیار کے مطابق لانا پڑتا ہے مثال کے طور پر رُباعی کے فارم میں میر تقی میر کا ایک مستزاد ملاحظہ ہو:-

تا چند غمِ دل کی حکایت کریئے　　　ہو ہو کر تنگ
کس کس سے شب و روز شکایت کریئے　　　آتا ہے ننگ
سختی کو کئی اے صنم کہاں تک کھینچے　　　ہے جی میں کہ اب
ہو نالہ ترے دل میں سرایت کریئے　　　پر تو ہے سنگ

اس مثال میں مستزاد کے فقروں میں بھی قافیہ کا التزام عین رُباعی کے نہج پر ہے۔ قافیہ کے معین اُصول و ضوابط سے انحراف نہیں کیا گیا البتہ اتنی جدت ضرور ہے کہ مروجہ صنفِ سخن کے آگے ایک فقرہ بڑھا دیا ہے جو پہلے مصرعہ کے خیال کو آگے بڑھاتا ہے۔ اس طرح قدیم فارم میں ذرا نیاپن آگیا ہے۔ اس کے برخلاف آزاد نظم میں بحر، قافیہ، ردیف اور اصنافِ سخن کے روایتی قوانین و ضوابط سے مکمل گریز کیا گیا ہے اس میں تمام پابندیوں سے زیادہ سے زیادہ انحراف کا رجحان پایا جاتا ہے۔ قدیم شعراء ولی، سراج، میر اور سودا، انشاء اور جرأت کے ہاں بھی یہ صنف استعمال ہوئی ہے۔ چونکہ قدیم فارسی اصنافِ سخن میں مستزاد بھی ایک فارم تھی (حالانکہ بہت کم استعمال کی گئی ہے) اس لئے اُردو کے قدیم شعراء نے جس طرح دیگر اصنافِ سخن میں فارسی کا تتبع کیا ہے۔ مستزاد میں بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کی ہے اور مستزاد کی مثالیں بھی صرف تفنن کے زمرہ میں شامل سمجھنی چاہئیں۔

پابند شاعری، نظم معریٰ اور آزاد نظم کی ظاہری ساخت کا اس قدر تعارف کافی ہے۔ آئندہ اُردو شاعری میں ہیئت کی تبدیلی کا تاریخی تجزیہ پیش کیا جائے گا اور اُردو شاعری کی تاریخ میں اس صنفِ سخن کا صحیح مقام متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ (باقی)

---

[1] بحوالہ مضمون عظمت اللہ خاں کے عروضی تجربے۔ ڈاکٹر مسعود حسن خاں

(چھ سو سے زیادہ عنوانات)

(ہزار شاعروں کے مختصر سوانح)

گلستانِ ہزار رنگ

مضمون وار منتخب اشعار کی نادر الوجود انسائکلوپیڈیا

مقدمہ

از حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

حضرت مولانا آزاد - "مجھے یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ سید بہاء الدین احمد صاحب نے ایک عرصہ کی محنت اور جستجو کے بعد ایسا مجموعہ طیار کرنے کی کوشش کی ہے ... انھوں نے اُردو شاعری کے نظر و مطالعہ کی ایک، نئی راہ کھول دی ہے۔ عنوانوں کے تجویز کرنے میں ہر طرح کے مواد و مطالب کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور اشعار کا انتخاب بھی سلیقے سے کیا گیا ....."

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین ...." آپ کی محنت کا پھل سب کے لئے قابلِ قدر ہے۔ میں آپ کو اس کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتا ہوں۔"

جناب رشید احمد صدیقی ... " میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک اس نوعیت کی جتنی کتابیں شایع ہوئی ہیں ان میں آپ کی کتاب سب سے بہتر ہے - مجموعہ ہر حیثیت سے قابلِ تعریف ہے .... اور آپ قابلِ تہنیت ...."

مولانا نیاز فتحپوری "نگار" میں .... " اس میں شک نہیں کہ یہ تالیف فاضل مصنف کے وسیع مطالعہ و حسنِ ذوق کی بڑی قیمتی دستاویز ہے .... دیباچہ کو اُردو ادب کی مختصر تاریخ کہنا غلط نہ ہوگا - یہ کتاب گویا تاریخ، تذکرہ اور انتخاب کا بڑا دلچسپ "آمیزہ" ہے جس کی ملک کو قدر کرنا چاہئے"

ماہنامہ "آجکل" دہلی .... " ہمیں امید ہے کہ اہل ذوق اس ادبی تحفہ کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور کوئی لائبریری اس سے خالی نہیں رہے گی ...."

ماہنامہ "صبا" حیدر آباد دکن ... گلستان ہزار رنگ ہے .... کتب خانوں، شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والوں اور بطور خاص طلبہ کے لئے ..... ایک قابل قدر تحفہ ہے ...."

قیمت مجلد دس روپئے، محصول ڈاک ذمہ ناشرین (نہایت نفیس کاغذ - بہترین کتابت و طباعت - بہت حسین جلد)

(یہ مجموعہ ہندی رسم الخط میں بھی شایع ہوا ہے، جس کی تقریظ راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد اور وزیر اعلیٰ بہار نے لکھی ہے)

ملنے کا پتہ :- گیان منزل پبلیکیشنز - دریا پور - پٹنہ - ۴ (بہار)

اے دوست --!!

(رضا قریشی گوالیاری)

کروں میں تجھ سے زمانے کا کیا گلہ اے دوست
فریب دوستی کھایا ہے بارہا اے دوست

کبھی شکایتیں کرتا تھا تجھ سے میں تیری،
مگر وہ تمھاری خامی کا اقتضا اے دوست

کوئی فرشتہ نہیں تو بھی آخر انساں ہے
نہیں ہے تجھ سے مجھے اب کوئی گلا اے دوست

بنالے اپنا زمانے کو تو - نہیں کچھ غم،
مگر ہے تجھ سے فقط اتنی التجا اے دوست

وفا کے واسطے کرنا نہ تو کسی سے وفا
یہاں وفاؤں کا بدلا نہیں وفا اے دوست

حصولِ لطف کی خاطر کسی پہ لطف نہ ہو
کہ دوستی کا نہیں ہے یہ مدعا اے دوست!

کسی سے پہونچے جو کلفت معاف کر دینا
نہیں ہے کوئی زمانے میں بے خطا اے دوست

نگاہِ پاک میں معصیتیں بھی ہوں گی نہاں
ملیں گے ایسے بھی کچھ تجھ کو پارسا اے دوست

ترے حضور میں آئیں گے دست بستہ بہت
ادب یہ ہوگا کہ جیسے ہے تو خدا اے دوست!

تو ان فریبوں میں آکر جو زک اٹھائے گا
تو ایک بھولا ہوا یاد آئے گا اے دوست

وہ دن بھی آئے گا ہوگی تلاش دوست تجھے
مگر دکھائے نہ وہ دن تجھے خدا اے دوست

حصولِ آب میں جس طرحِ تشنہ لب کوئی
بجائے آب یہ دیکھے سراب تھا اے دوست!

قریبِ شام کوئی جیسے کارواں سے ہو گم
بوقت صبح کوئی جیسے لٹ گیا اے دوست!!

ذرا یہ سوچ تو اُس وقت کیا کرے کوئی
حقیقتوں پہ گماں ہو جو خواب کا اے دوست

تجھی سے پوچھ رہا ہوں ذرا بتا مجھ کو
اسی خلش میں ہوں اب میں بھی مبتلا اے دوست

عیاں ہے رنگ زمانے کا اور تو برہم ہے
بنائے دوست کسے اب ترا رضا اے دوست

(طارق اختر انصاری)

کب تک غمِ حیات سے دامن بچاؤں میں
بہتر ہے اب یہی کہ تجھے بھول جاؤں میں!

اک میں کہ بھول کر بھی نہ تجھ کو بھلا سکوں
اِک تو! کہ بھول کر نہ جسے یاد آؤں میں!!

واقف مزاجِ برق و دلِ باغباں سے ہوں
کیا دیکھ کر چمن میں نشیمن بناؤں میں!!

تیری نوازشوں کا اے عشق پوچھنا کیا
رو یا ہے مدتوں دل دم بھر خوشی جو چاہی!!

ناکامیوں کا دل کی اب کیا سبب بتاؤں
کچھ اپنی کم نصیبی کچھ اُن کی کم نگاہی!!

(شیدا کاملی احمد آبادی)

تری ادا کے کرشمے۔ تری نظر کے فسوں
یہ کہہ رہے ہیں کہ لُٹ جاؤں اور اُف نہ کروں

ہے عشق حُسن کی تابش! کہ حسن عشق کی ضو
قریب آؤ تو اس کا بھی فیصلہ کر دوں

مجھے زبان پہ قابو۔ مجھے کلام پہ ناز...
یہ اور بات ہے تیرے حضور کچھ نہ کہوں

یہ کہہ رہا ہے مرا ذوقِ جستجو شیدا
"خدا کرے کہ قیامت تک اُن کو پا نہ سکوں"

(محمود عشقی)

ہنس ہنس کے تجھ سے ہو تو گئے ہم جدا مگر
ڈوبا وہ دل کہ آنکھوں کے سوتے اُبل پڑے

اہلِ خرد صدائے جرس کے ہیں منتظر
دیوانے منزلوں سے بھی آگے نکل گئے

دور میں یوں تو جام بہت ہیں
پھر بھی تشنہ کام بہت ہیں

کس کو پوجیں کس کو نہ پوجیں،
نظروں میں اصنام بہت ہیں

اوروں کا تو ذکر ہی کیا ہے
ہم پر بھی الزام بہت ہیں

مطبوعات موصولہ

آشفتہ بیانی میری

جناب رشید احمد صدیقی (پروفیسر علیگڈھ یونیورسٹی) کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے علیگڈھ سے اپنے تعلقات کی داستان بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے - رشید صاحب کا وطن جونپور ہے اور ۱۹۱۴ء تک وہیں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی - اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں وہ علیگڈھ آئے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔

اس کتاب میں اول اول انھوں نے جونپور کے حالات اور اس کی تاریخی و ثقافتی اہمیت کا ذکر کیا ہے اور اسی کے ساتھ اپنے ابتدائی زمانہ طالب علمی کے ذوق و مشاغل کا بھی - اس کے بعد علیگڈھ کی باتیں شروع ہوتی ہیں - اکابر علیگڈھ میں سب سے پہلے انھوں نے بانی کالج سرسید کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد دوسرے اکابر کا جو کسی نہ کسی حیثیت سے علی گڑھ یونیورسٹی کی تاریخ سے تعلق رکھتے تھے - اس سلسلہ میں حالی، شبلی کے علاوہ علی برادرس، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، مولانا سہیل مرحوم اور وہاں کے مشہور اساتذہ اور ان تمام تحریکات کا جو طلبہ و اساتذہ سے تعلق رکھتی ہیں، ذکر کیا گیا ہے۔

رشید صاحب نے اس کتاب میں اپنی ظریفانہ طرز انشاء سے بہت کم کام لیا ہے اور اس کی ضرورت بھی تھی، اخیر میں تمام ان ادیبوں اور مصنفوں کی فہرست تصانیف درج کر دی ہے جو کسی نہ کسی طرح علیگڈھ سے مستفیض ہوئے۔

یہ کتاب جسے ہم یقیناً آشفتہ بیانی نہیں کہہ سکتے، علیگڈھ یونیورسٹی کی ایک مختصر سی ڈائرکٹری ہے اور تاریخی حیثیت سے خاص اہمیت رکھتی ہے - صفحات ۱۹۲ - قیمت عہ - ملنے کا پتہ :- سرسید بک ڈپو، شمشاد بلڈنگ، علیگڈھ -

فکر اور ادب

جناب دیویندر اسّر کی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے جدید ادب کے فکری پہلو پر مختلف زاویوں سے گفتگو کی ہے۔

اس میں ٹالسٹائی اور کارل مارکس کے علاوہ بہت سے ان مغربی نقادوں کے بھی حوالے ملتے ہیں جنھوں نے ادب جدید کو پروان چڑھایا اور اسے ایک نئی فنی حیثیت دی - یہ کتاب بجائے خود بڑی اچھی انتقادی تصنیف ہے اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب دیویندر نے مغربی مصنفین کی تصانیف کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنے نتائج مطالعہ کو انھوں نے جس نہج و اسلوب سے پیش کیا ہے وہ طالب علمانہ نہیں بلکہ استادانہ و ماہرانہ کوشش ہے - ادب تفریح کی چیز بھی ہے اور فکر و بصیرت کی بھی - اور جب ان دونوں کا اجتماع کسی جگہ ہوجائے تو اس کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے - یہ کتاب اسی خصوصیت کی حامل ہے - ضخامت ۱۹۲ صفحات - قیمت تین روپیہ آٹھ آنے ملنے کا پتہ :- مکتبۂ قصرِ اردو - اردو بازار - دہلی -

اساس تہذیب

تالیف ہے ڈاکٹر سید عبداللطیف (حیدرآباد) کی جس میں انھوں نے قرآن و احادیث سے وہ اقتباسات پیش کئے ہیں جن سے اسلامی ثقافت کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے - اس کتاب کے تین حصے ہیں، پہلا حصہ توحید عمل صالح، اتحاد انسانی اور مذہبی رواداری سے متعلق ہے، دوسرے حصہ کا تعلق ان اسباب رزق و حیات، اکتسابی زندگی، حصول علم اور معاملات زندگی سے ہے - تیسرے حصہ میں قرآن کا اقتصادی نظام پیش کیا گیا ہے اور چوتھے میں معاشرہ و حکومت کو لیا گیا ہے -

پیش لفظ میں فاضل مولف نے بہت اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ اس بنیادی خیال کو ظاہر کر دیا ہے جو اس تالیف کا باعث ہوا۔

مجھے اس تالیف کی یہ خصوصیت بہت پسند آئی کہ انھوں نے آیات و احادیث کا صرف ترجمہ کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ان کی کوئی شرح و تفسیر نہیں کی اور غالباً اس کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ جس موضوع پر جو آیات و احادیث پیش کی گئی ہیں وہ اپنی جگہ خود بہت صاف و واضح ہیں اور ان کو سمجھانے کے لئے کسی تمہید و تفسیر کی ضرورت نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا مطالعہ مذہبیات کے باب میں بڑا وسیع ہے اور وہ زیادہ تر انھیں مسایل پر گفتگو کرتے ہیں جو نظریۂ حیات و معاملات زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور مابعد الطبیعیاتی مسایل کے جھگڑے میں نہیں پڑتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ فاضل مولف کی یہ کتاب عام و خاص دونوں طبقوں کے لئے مفید ہے، بشرط آنکہ عمل کی نیت سے اس کا مطالعہ کیا جائے۔ اس کتاب کو انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹیڈیز حیدر آباد نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے۔

شعر و ادب مجموعہ ہے مولانا اختر علی تلہری کے آٹھ ادبی و انتقادی مضامین کا جسے خود انھوں نے حال ہی میں شایع کیا ہے اس مجموعہ کے مضامین کی فہرست یہ ہے:۔

(۱) اردو شاعری اور گل و بلبل ۔۔ (۲) مشاعروں کی افادیت ۔۔ (۳) انسانیت پسند ادب ۔۔ (۴) ڈانٹے کا سرمایۂ شعر و ادب (۵) موازنۂ مومن و غالب ۔۔ (۶) مسدس مد و جزر اسلام ۔۔ (۷) اثر لکھنوی کی غزلیہ شاعری ۔۔ (۸) علامہ عالی کی فارسی و عربی شاعری

یہ تمام مضامین اپنی اپنی جگہ خاص وزن و معنویت رکھتے ہیں اور ان کی ترتیب میں محض لفاظی سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ مفکرانہ انتقاد اور استنتاج منطقی سے بھی کام لیا گیا ہے جو مولانا تلہری کا طبعی رجحان ہے۔

موازنۂ مومن و غالب میں انھوں نے غالب کو مومن پر ترجیح دی ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن انھوں نے اس نکتہ کو نظر انداز کر دیا کہ مومن کو اگر غالب پر ترجیح دی جاتی ہے تو صرف اس کی جنسی شاعری کے لحاظ سے ورنہ یوں مجموعی طور پر غالب یقیناً مومن سے زیادہ بلند شاعر تھا۔

مد و جزر اسلام کے سلسلہ میں مسدس حالی اور کلام انیس کا موازنہ کرنا بھی درست نہیں۔ کیونکہ ان دونوں کا موضوع، اسلوب، اور زمانہ بالکل ایک دوسرے سے جدا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ فاضل نقاد کو کیوں اس موازنہ کی ضرورت پیش آئی۔

یہ مجموعہ تین روپیہ میں دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

شعور اور تنقیدی شعور دوسرا مجموعہ ہے پروفیسر شکیل الرحمان (سری پرتاب کالج سرینگر) کے انتقادی مقالات کا۔ پہلے مقالہ میں فیض کی چند مشہور نظموں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ فیض کی بابت شکیل کا یہ کہنا کہ انکا مطالعہ وسیع ہے لیکن گہرا نہیں اور اسی کے ساتھ یہ اعتراف کہ ان میں بعض حالیہ نظموں میں گہرے مطالعہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ایک حد تک متضاد بات ہے اور غالباً صحیح بھی نہیں۔ فیض کا مطالعہ زیادہ تر مغربی لٹریچر سے تعلق رکھتا ہے اور وہی خصوصیات وہ اردو نظم میں بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ کبھی کامیاب ہو جاتے ہیں اور کبھی نہیں، اس کا تعلق مطالعہ کی وسعت و گہرائی سے نہیں بلکہ صرف اس امر سے ہے کہ انھیں زبان پر پوری قدرت حاصل نہیں اور فارسی مطالعہ ان کا ناکافی ہے۔ فیض کی شاعری خالص تجرباتی شاعری ہے اور اس نوع کی شاعری کو اسی انداز سے دیکھنا چاہئے۔ فیض کی وہ خصوصیت جو عام طور پر ترقی پسند شعراء میں نہیں پائی جاتی، اس کا دلکش غزلیہ لب و لہجہ ہے اور یہی بات مجاز میں بھی تھی، لیکن فرق یہ ہے کہ فیض کے یہاں اچھوتا پن زیادہ ہے اور مجاز کے یہاں رنگینی۔

دوسرا مضمون منٹو کی حقیقت نگاری سے متعلق ہے، تیسرا غزل کی ٹکنک سے تعلق رکھتا ہے، چوتھے مقالہ میں روش کے سوز و گداز پر گفتگو کی گئی ہے، اور پانچویں میں جدید افسانوی مطالبات پر۔ اسکے بعد کے مقالوں میں جذبی، مخدوم، احمد ندیم، فانی، میراجی کی شاعری، اور اختر اورینوی اور سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری سے بحث کی گئی ہے۔ آخری مقالہ نصرت کی ایک رزمیہ مثنوی پر ہے ان مقالات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پروفیسر شکیل نے ان میں خود اپنی رائے ظاہر کی ہے اور وہ دوسروں سے متاثر

نہیں ہوئے وہ نہ مدح سرائی کے قابل ہیں نہ "قدح نگاری" کے - اپنی پسند و ناپسند دونوں کا اظہار آزادی سے کردیتے ہیں لیکن اپنے ب ولہجہ کے لحاظ سے داد کے ساتھ وہ بیداد کے قابل نہیں معلوم ہوتے -

پروفیسر شکیل ہمارے نوجوان نقادوں میں بڑے ہوش و گوش کے نقاد ہیں اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس میں خود اعتمادی پائی جاتی ہے لیکن خود فریبی نہیں، اور یہ بڑی بات ہے - یہ مجموعہ ہے میں شاہین بک اسٹال سرینگر (کشمیر) سے مل سکتا ہے -

اوراقِ پریشاں مجموعہ ہے جناب چودھری محمد مصطفےٰ حسین بسمل لکھنوی (مرحوم) کی غزلوں کا۔ بسمل مرحوم لکھنؤ کے ایک تعلقہ دار خاندان کے معزز فرد تھے اور اپنے اخلاق کے لحاظ سے بڑے سچے اور پیارے انسان - وہ یشہ در شاعر نہ تھے اور نہ کبھی کوئی غزل انھوں نے "داد خواہی" کے لئے لکھی - دل کے بے ساختہ جذبات جو زیادہ تر بلند اخلاقی حساس سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی شاعری کے خلاق تھے اور اسی لئے ان کے کلام میں ہم کو ایک ایسی دل دکھا دینے والی کیفیت تی ہے، جس کا تعلق محض خلوص و صداقت سے ہے - لکھنؤ کی شستہ زبان میں جب کوئی ایسی چیز نظر آجاتی ہے تو بے اختیار س کی طرف دل کھنچتا ہے اور بسمل کی غزلوں میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے -

قیمت عہ - ملنے کا پتہ :- سید دلاور حسین ۲۳ بی ایبٹ روڈ لکھنؤ -

عکسِ خیال جناب ارشد صدیقی کو انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ کرنے میں خاص مہارت حاصل ہے، اور "عکس خیال" ان کی اس اہلیت کی بڑی اہم دستاویز ہے - کسی غیر زبان کے اشعار کا ترجمہ نثر میں بھی آسان نہیں چہ جائیکہ ظم، لیکن ارشد صاحب کو اس فن سے بڑی فطری مناسبت ہے اور اس مجموعہ کے مطالعہ سے (جو پندرہ مغربی شعراء کی ظموں کے ترجمہ پر مشتمل ہے) معلوم ہوتا ہے کہ اس نوع کے "استعارہ" میں جس سلیقہ و حسن ذوق سے انھوں نے کام لیا ہے یقیناً قابل تحسین و آفرین ہے -

یہ مجموعہ دو روپیہ میں دلکش کدہ بھوپال سے مل سکتا ہے -

اعری کے نئے موڑ تذکرہ ہے ہندی رسم خط میں اس عہد کے تمام ان شعراء کا جو ٹکنک اور خیال دونوں حیثیتوں سے ترقی پسند کہلاتے ہیں - اس تذکرہ میں ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۷ء تک کے تمام شعراء کو لے لیا گیا ہے اور ان کے لام کا نمونہ بھی دیدیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ اردو کے مشکل الفاظ کا ترجمہ بھی ہندی میں دیدیا گیا ہے - بھارتی جان پیٹھ کاشی مشہور ادارہ ہے جو اس وقت تک متعدد تذکرے شعراء کے شایع کرچکا ہے - قیمت تین روپیہ -

اعری کے نئے دور اس سلسلہ میں بھارتی جان پیٹھ کاشی نے جوش ملیح آبادی کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے جو ۳۱۲ صفحات کو محیط ہے - اس انتخاب میں جوش کے تمام قابل ذکر کلام کو لے لیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ جابجا اسکی احت بھی کردی ہے - اس کتاب میں بھی تمام مشکل الفاظ کا ترجمہ ہندی میں کردیا گیا ہے، جو بڑی ضروری چیز تھی، اس کی قیمت تین روپیہ ہے -

ھو اور بڑھو جناب محمد اسحاق صدیقی کی نہایت دلچسپ و مفید تالیف ہے جس میں انھوں نے تاریخی واقعات سے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا میں کیسے کیسے اپاہج اور ناکارہ لوگوں نے اپنی کوشش سے تعلیم حاصل کی اور دنیا میں بڑا نام - یہ کتاب بچوں او عوام میں ذوق علم پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے اور اس قدر پسندیدہ طریقہ سے کہ مرکزی حکومت کی طرف سے و روپیہ انعام کی مستحق قرار پائی - کتابت و طباعت کی پاکیزگی کے علاوہ متعدد تصاویر کی وجہ سے اس کی دلچسپی بہت ڑھ گئی ہے -

قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ :- ادارۂ جہاں نما - گوئن روڈ - لکھنؤ -

چاند تارے

بزمِ ریاض الادب کوٹری (مغربی پاکستان) نے اس نام سے چند مضامین مختلف حضرات کے یکجا کردئے ہیں جو ادبیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلا حصہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ تحقیقی و انتقادی مضامین پر، ان میں وحشت کی فارسی شاعری، اور نذرالاسلام کی فنکاری خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ تیسرا حصہ کہانیوں کا ہے اور خوب ہے، چوتھا حصہ دوسری زبانوں کی منتخب کہانیوں کا ترجمہ ہے اور پانچواں حصہ جناب شاد کلکتوی کے مزاحیہ کلام پر مشتمل ہے۔

یہ بزم کئی سال سے اُردو کی اچھی خدمت انجام دے رہی ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ریگستان سندھ کے ایک دور افتادہ مقام سے اس چشمۂ ادب کا تعلق ہے تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔

ابوالکلام آزاد

جناب جگناتھ آزاد کی نظم ہے جو انھوں نے مولانا کے حادثۂ وفات سے متاثر ہوکر لکھی، یہ نظم ۱۴ بندوں یا ۲۴ اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں شک نہیں کہ شاعر نے اس نظم میں اپنا دل نکال کر سامنے رکھدیا ہے۔ جذبات و تاثرات کے ساتھ ساتھ انھوں نے مولانا مرحوم کی خصوصیات فضل و کمال کا بھی ذکر بڑی شان سے کیا ہے اور ادبی حیثیت سے اس میں تمام وہ خوبیاں پائی جاتی ہیں جو جگناتھ آزاد کی خصوصیات ہیں، قیمت ۲۵ نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ:- ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ

فیضانِ اسلام

تصنیف ہے پروفیسر محمود بریلوی کی جو پاکستان کے مشہور ماہرِ تعلیم اور اسلامی تاریخ و ثقافت کے بڑے باخبر اسکالر ہیں۔

یہ تصنیف دو حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں حالات قبل از اسلام، ترقی و فتوحات اسلام، اقتصادی و سیاسی اثرات اسلام پر مورخانہ گفتگو کی گئی ہے، دوسرا حصہ عہدِ حاضر سے تعلق رکھتا ہے، جس میں شمالی عرب، مشرق وسطیٰ اور سوویٹ روس کی اسلامی حکومتوں کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔ اس طرح یہ کتاب اسلامی دُنیا کے قدیم و جدید دونوں زمانوں کے حالات پر حاوی ہے اور اس میں شک نہیں کہ فاضل مصنف نے ان حالات کے فراہم کرنے میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔ کتاب بڑے سلیقے سے ٹائپ میں مجلد شایع کی گئی ہے اور ان حضرات کے لئے جو تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں بہت مفید ہے۔ فاضل مصنف موتمر اسلامی قاہرہ کے شعبۂ مطبوعات کے مہتمم ہیں اور ان کی متعدد کتابیں اس وقت تک شایع ہوچکی ہیں، اس کتاب میں ہر عہد کا جغرافی نقشہ بھی دیدیا گیا ہے اور اس طرح اس کی افادی حیثیت بہت زیادہ ہوگئی ہے۔

یہ کتاب فیروز سنز کراچی سے پانچ روپیہ آٹھ آنے میں مل سکتی ہے۔

بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقاء

مقالہ ہے پروفیسر اختر اورینوی صدر شعبۂ اُردو پٹنہ یونیورسٹی کا جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے۔ اس میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ صوبۂ بہار نے اُردو ادب کی کتنی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ مقدمہ میں اُردو زبان کے آغاز و ارتقاء پر گفتگو کی گئی ہے، اس کے بعد پہلے باب میں عہدِ عالمگیر سے لے کر انگریزی دور تک اُردو کی رفتارِ ترقی کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں بہار کی اُردو شاعری پر بسیط تبصرہ کرتے ہوئے ۱۲۷ھ سے لیکر ۱۹۵۶ء تک کے مشہور شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سب سے پہلا نام مرزا عبدالقادر بیدل کا اور آخری نام قادر علی فگار عظیم آبادی کا ہے اور اسی کے ساتھ اس کے بعد بہار کے تذکرہ نگار شعراء کو لیا ہے اور دہلی کے ان شاعروں کو جو عظیم آباد میں آباد ہوگئے تھے۔

اس کے بعد یہاں کے مشہور ماہر نثر نگار ادیبوں کا ذکر کیا گیا ہے، اس کتاب کی اہمیت و افادیت اس کے موضوع اور عنوانات سے نمایاں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ پہلی اُردو تصنیف ہے جس میں صرف صوبۂ بہار کی ادبی خدمات کو سامنے رکھا گیا ہے۔ فاضل مصنف ملک کے مشہور نقادوں میں سے ہیں اور خود زبان کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دے چکے ہیں۔

کتاب اپنی زبان اور طرزِ ادا کے لحاظ سے نہایت سلیس و شگفتہ ہے۔ کتاب میں آٹھ صوفیہ شعراء کی تصاویر بھی شامل کردی گئی ہیں۔ کاغذ بہت دبیز استعمال کیا گیا ہے اور طباعت وغیرہ نہایت پاکیزہ۔

جواہر لال نہرو کی تقریریں

نہرو کی پانچ ہندی یا اُردو تقریریں ہیں جو انھوں نے پانچ موقعوں پر کی تھیں۔ ان میں سے ایک کا عنوان "نوجوانوں کا میلہ" ہے، دوسری کا "پانچ سالہ یوجنا" تیسری کا "پنچایتی راج" چوتھی کا "بڑی چیزوں کے بڑے دام" اور پانچویں کا "۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی"۔ پنڈت نہرو اپنے ملکۂ تقریر کے لحاظ سے صحیح معنی میں حیوان ناطق ہیں اور وہ کبھی تقریر کرنے سے نہیں گھبراتے۔ ان کی تقریروں کی بنیاد صرف ان کی جذباتیت پر قایم ہے اور اس لئے ان کو کبھی یہ سوچنا نہیں پڑتا کہ کیا اور کیونکر کرنا چاہئے۔ نہرو جو کچھ کہتے ہیں دل سے کہتے ہیں اور اسی لئے اس کا اثر دلوں پر ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ تقریریں بھی اسی قسم کی ہیں جنھیں انگریزی میں Thinking aloud کہتے ہیں اور جن سے ہم ان کے بطون کا مطالعہ آسانی سے کرسکتے ہیں۔ ہم کو جو بات سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ ہے کہ زبان کے لحاظ سے وہ واقعی نہرو کی تقریریں ہیں اور ہندی یا سنسکرت ہیں ترجمہ کرکے انھیں پیش نہیں کیا گیا۔ ہر تقریر کی قیمت دس نیا پیسہ ہے اور ملنے کا پتہ: پبلی کیشنز ڈویژن۔ دہلی۔

آثار ابوالکلام

دوسرا اڈیشن ہے قاضی عبدالغفار مرحوم کی اس مشہور کتاب کا جو اب سے ۹ سال قبل شایع ہوکر کافی داد حاصل کرچکی ہے۔

مولانا آزاد کے بعد اب ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر متعدد کتابیں لکھی جائیں گی جن میں کافی شرح و بسط سے کام لیا جائیگا لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ قاضی صاحب کی اس کتاب کو ہمیشہ بنیادی حیثیت حاصل رہے گی نہ اس لئے کہ وہ اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ قاضی صاحب کا سا طرزِ بیان و تحریر ہر شخص کو میسر نہیں۔

قاضی صاحب نے مولانا کا بہت قریب سے مطالعہ کیا تھا اور جن جن تاثرات سے وہ مولانا کی صحبت میں دوچار ہوئے وہ زیادہ نفسیاتی و سیاسی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا آزاد کی ادبی، علمی، سیاسی و صحافتی زندگی پر علحدہ علحدہ لکھنا شاید زیادہ آسان ہو لیکن کوئی ایسی کتاب لکھنا جو مولانا کی ان تمام خصوصیات پر بیک وقت واضح روشنی ڈال سکے۔ مشکل کام تھا جسے قاضی صاحب نے انتہائی خلوص کے ساتھ انجام دیا۔ یہ کتاب ۱۲ میں آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی سے مل سکتی ہے۔

محشر خیال

تیسرا اڈیشن ہے سجاد انصاری کے مقالات، ڈراموں اور نظموں کے مجموعہ کا۔ اس میں ۲۳ مختصر مقالے ہیں جنھیں Essay کہنا زیادہ موزوں ہوگا، ایک طویل ڈرامہ ہے "روزِ جزا" ۲ نظمیں ہیں اور متعدد غزلیں۔

سجاد انصاری اپنی آزاد خیالی و آزاد نگاری کے لحاظ سے نہ صرف یہ کہ صفِ اول کے ادیبوں میں شمار کئے جاتے تھے بلکہ بہ لحاظ تقدم وہ اس کے بانی و محرک اصلی سمجھے جاتے ہیں۔

سجادؔ روایاتی مذہب و عقاید کے سخت مخالف تھے اور انھوں نے جو کچھ لکھا اپنے اس مشن کی تائید میں لکھا۔ یہاں تک کہ وہ ملحد و بیدین قرار دئے گئے جو ان کی آزاد خیالی کی بہترین داد تھی۔

سجاد کا اندازِ تحریر Essay سے زیادہ ملتا جلتا ہے اور اسی لئے ہمیں اس میں وہ سب کچھ ملتا ہے جو ذوق و عقل دونوں کے لئے قابلِ قبول ہے۔ سجادؔ غیر معمولی ذہین انسان تھے اور بڑے بےلاگ لکھنے والوں میں تھے۔ اپنی ہی زندگی میں وہ اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے بہت بدنام تھے، یعنی جیتے ہی جی ان کو اپنے آرٹ کی داد مل گئی تھی اور اگر عمر وفا کرتی تو ان کا شمار آج شاید سرخیلِ ملاحدہ میں ہوتا۔

قیمت تین روپیہ ۳۰ نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ:- آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل۔ دہلی

میخانہ
مجموعہ ہے جناب کشن دت طوفاں دہلوی کی نظموں، غزلوں اور قطعات کا، پہلی نظم کا عنوان میخانہ ہے۔ یہ خاصی طویل نظم ہے جو صرف مے و مینا کے ذکر تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کو ایک رمز (Symbol) قرار دیکر بہت سے ہمہ باتی حقایق کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے۔

غزلیں زیادہ نہیں ہیں، لیکن جتنی بھی ہیں، "خاصہ" کی چیز ہیں، دلکش، عمیق اور عامی سطح سے بہت بلند۔ یہی خصوصیت نظموں اور قطعات میں بھی پائی جاتی ہے۔

کلام جتنا پاکیزہ ہے، اتنے ہی سلیقہ سے اسے شایع بھی کیا گیا ہے۔ قیمت سوا دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ قصرِ اُردو۔ دہلی

میر کارواں
جناب ناظر الحسینی اڈیٹر رفنامہ اخوت کلکتہ کی تالیف ہے جس میں انھوں نے مولانا آزاد کی زندگی، انکے نظریۂ حیات ان کے علمی، و ادبی کارناموں اور سیاسی معاملات کا ذکر کیا ہے۔ کتاب کی ضخامت صرف ۶۴ صفحات ہے پھر بھی مولانا آزاد کی زندگی کا کوئی پہلو چھٹنے نہیں پایا۔ ان کے حالات میں البتہ کہیں کہیں تسامح نظر آتا ہے مثلاً یہ کہ انھوں نے مصر کے جامعۂ ازہر میں دو سال تعلیم حاصل کی۔ حالانکہ وہ مصر حصول تعلیم کے لئے نہیں گئے تھے اور ان کی تعلیم کلکتہ ہی میں پوری ہو گئی تھی۔ طباعت و کتابت وغیرہ معمولی ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ اکبری دانشکدہ ۱۰/۳ اکاشی ناتھ ملک لین. کلکتہ

ادارہ فروغ اُردو (نقوش) لاہور کے مطبوعات

اور

اس کے خصوصی سالنامے

آپ ہم سے حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ جو کتابیں یا سالنامے مطلوب ہوں انکی قیمت ہمیں بھیجدیجئے پندرہ دن کے اندر ذریعہ رجسٹری آپ کو ملجائیں گی (وی، پی کے ذریعہ سے نہیں بھیجی جاسکتیں) آرڈر دس روپے سے کم کا نہ ہو اور محصول ڈاک بحساب ۱۵ فیصدی روانہ کیا جائے۔ منیجر نگار لکھنؤ

تاریخی و ادبی کتابیں

ید بیضا ۔۔ سید عابد علی عابد کے دلنشین ڈراموں کا مجموعہ ۔ ۵؍
سیاست الٰہیہ ۔۔۔ امام ابن تیمیہ کی تصنیف کا ترجمہ ۔ ۶؍
ہماری داستانیں ۔ ہماری قدیم داستانوں کی داستان ۔ ۵؍
نقوش لطیف ۔ مرتبہ احمد ندیم قاسمی ۔۔۔ ۳؍
مضامین جمال الدین افغانی ۔۔۔ ۵؍
انتقاد ۔ سید عابد علی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۳؍
پانچ ناولٹ ۔ مرتبہ وقار عظیم ۔ اس مجموعہ میں منٹو شوکت تھانوی، اشفاق احمد، اے حمید اور انتصار حسین کے بہترین ناولٹ ہیں ۔۔۔ ۳؍
تذکرہ شعرائے متغزلین ۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی ۔ ۲؍
امراؤ جان ادا ۔۔۔ ۳؍

تصانیف شوکت تھانوی

مولانا ۔۔۔ ۳؍ — غزالہ ۔۔۔ ۲؍
خدانخواستہ ۳؍ — سودیشی ریل ۔ ۳؍
کتیا ۔۔۔ ۳؍ — سانچ کو آنچ ۔ ۳؍
کارٹون ۔ بے قاعدہ ۶؍ — بار خاطر ۔ ۴؍
بقراط ۔۔ ۴؍ — جوڑ توڑ ۔ ۴؍

مضامین شوکت ۔۔۔۔۔ ۶؍
قاضی جی (۳ حصے) فی حصہ ۔۔۔ ۲؍
غالب کے ڈرامے ۔۔۔ ۶؍
وغیرہ وغیرہ ۔۔۔ ۳؍

نقوش کے چند خصوصی نمبر

افسانہ نمبر ۔ مجلد ۔۔۔۔ ۱۲؍
شخصیات نمبر ۲ ۔۔۔۔ ۱۰؍
منٹو نمبر ۔۔۔۔۔ ۶؍
مکاتیب نمبر ۔۔۔۔۔ ۱۰؍